Meena Kumari

ہم چاہتے ہیں کہ اردو کا ہر ناول ہر کتاب ہر افسانہ اور ہر تحریر آپ کی دسترس میں ہو-اس کے لئے ہمیں آپ کی ضرورت ہے- آپ کچھ بھی لکھیں ہمیں بھیجیں ہم اسے اپنے بلوگ پر اپ لوڈ کر دیں گے- کچھ بھی ہو ہم اسے پی ڈی ایف میں کنورٹ کر کے کتابی شکل میں ڈھال لیں گے-الحمداللہ ہمارے بلوگ پر ۳۵۰۰ سے زائدکتابوں کے ایکٹو لنک موجود ہیں، اور ہماری سائٹ ڈیلی آپ ڈیٹ ہوتی ہے- تو چلئیے پھر قلم اٹھائیں اور شروع ہو جائیں، اپنی تحریر نیچے دئے گئے ای میل اڈریس پر بھجیں- کیونکہ ہم دیر نہیں کرتے،

khalidjee@hotmail.com

کبھی نہ بھلائی جاسکنے والی اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات

قسط:1

وہ 31، مارچ 1972ء کی رات تھی۔ ممبئی کے ساحلی علاقے میں ایک شاندار بنگلے کے طویل و عریض لان پر ایک پارٹی جاری تھی۔ ماحول پر سکون تھا۔ پارٹی کے شرکاء مرد اور خواتین جو قیمتی اور فیشن ایبل لباسوں میں تھے، ٹولیوں کی صورت میں اِدھر اُدھر کھڑے دھیمی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ پس منظر میں کہیں سے فلم ''پاکیزہ'' کا گانا نہایت مدھم آواز میں سنائی دے رہا تھا اور کانوں کو بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ لان پر ایک عارضی بار بھی بنا ہوا تھا جہاں سے مہمان گلاسوں میں اپنی اپنی پسند کا مشروب لے کر، اس کی چسکیاں لیتے ہوئے ماحول اور گفتگو سے مزید لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔

فضا میں مختلف کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو بھی محسوس کی جاسکتی تھی۔ روشنیاں مدھم تھیں۔ اس کے باوجود سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی فلم کا کوئی خوبصورت منظر پکچرائز کیا جارہا ہو۔ ایک طرف مہمانوں کی ٹولی کے درمیان ایک شخص کھڑا اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ اچھا خاصا شناسا معلوم ہو رہا تھا لیکن شاید کسی کو بھی اس کا نام یاد نہیں تھا۔ وہ اچھی خاصی شخصیت کا مالک تھا اور عمدہ گفتگو کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس کے گرد لوگ جمع تھے اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

اس وقت یقیناً اس کی انا کو بڑی ٹھیس پہنچی ہو گی جب اس کے سامعین میں سے اچانک کسی نے پوچھ لیا ''معاف کیجئے... آپ کا نام کیا ہے؟''

اس شخص نے سیدھی طرح اس سیدھے سادے سوال کا جواب دینے اور اپنا نام بتانے کے بجائے یہ بتانا شروع کر دیا کہ وہ کن کن فلموں میں کون کون سے کردار ادا کر چکا ہے۔ وہ یقیناً چھوٹے موٹے کردار ہی ہوں گے، اسی لئے لوگوں کو اس کا نام یاد نہیں آرہا تھا۔ شاید اسی حقیقت کا احساس ہونے پر اس نے فخریہ لہجے میں بتایا کہ عنقریب کسی نے اسے ایک فلم میں ہیرو کے طور پر سائن کرنے کا وعدہ بھی کر رکھا تھا۔ اس کے باوجود جب اس کے سامعین اس سے کچھ زیادہ مرعوب یا متاثر دکھائی نہ دیئے تو اس نے اپنا زورِ بیان یہ بتانے میں صرف کرنا شروع کر دیا کہ وہ مستقبل کا سپر اسٹار تھا اور وہ وقت دور نہیں تھا جب گلی گلی اور گھر گھر اس کے چرچے ہونے والے تھے۔

جب اس نے دیکھا کہ اس بات سے بھی اس کے سامعین کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے تو وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ اس لمحے اس کی حالت کسی حد تک قابلِ رحم دکھائی دینے لگی۔ اچانک اسے جیسے کوئی اہم بات یاد آئی اور وہ چونک کر بولا ''آپ لوگوں کو معلوم ہے... آج شام مینا کماری کا انتقال ہو گیا ہے؟''

یکدم چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔ پس منظر سے ابھرنے والی موسیقی کی آواز بھی جیسے معدوم ہو گئی۔ اس شخص کی بات صرف اس کے گرد کھڑے لوگوں کی ٹولی نے ہی نہیں بلکہ آس پاس کے کئی دوسرے لوگوں نے بھی سن لی تھی اور وہ شاید چند لمحوں کے لئے بولنا ہی بھول گئے تھے۔ بت بن کر رہ گئے تھے۔ عموماً کسی بہت ہی خاص اور غیر معمولی انسان کی موت کی خبر اسی طرح سنی جاتی ہے۔ سننے والے گویا چند لمحوں کے لئے سکتے کی سی کیفیت میں آجاتے ہیں۔ امریکی صدر جان ایف کینیڈی کے قتل کی خبر بھی اسی طرح سنی گئی تھی۔ چند لمحوں کے لئے لوگ سناٹے میں آگئے تھے، ان پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

جس شخص نے یہ خبر سنائی تھی، اب اس کی مزید کوئی بات سننے سے لوگوں کی گویا کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اس کے ارد گرد کھڑے لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ ہر طرف اس خبر پر تبصرے جاری تھے۔ کئی لوگوں کی آواز بھرا گئی تھی۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز انہیں داغِ جدائی دے گیا ہو۔ مینا کماری نے زندگی بھر اپنی فلموں میں رنج و الم، زندگی کے دکھوں اور مظلومیت کی عکاسی کی۔ حقیقی زندگی میں اس کی موت بھی گویا لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا المیہ، ایک بہت بڑا صدمہ بن کر سامنے آئی تھی۔ فلمیں دیکھنے والوں کے لئے وہ صحیح معنوں میں ایک روایتی مشرقی عورت تھیں۔ ''پاکیزہ'' صرف ان کی ایک فلم کا ہی نام نہیں تھا بلکہ لوگوں کے ذہنوں میں ان کی شخصیت کا تصور بھی بہت ہی پاکیزہ قسم کا تھا۔ وہ فلم میں خواہ طوائف کا کردار ادا کرتیں لیکن لوگوں کی نظر میں ان کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔

جب کوئی خاص اور غیر معمولی طور پر مشہور ہستی مر جاتی ہے اور اچانک اس کی موت کی خبر آتی ہے تو ہر سننے والے کی زبان پر سوالات ضرور آتے ہیں۔ ارے... وہ کیسے مر گیا؟ کیا ہوا تھا اسے؟ اگر اسے کسی نے مارا ہو تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں مارا؟ یوں ہر بڑے اور مشہور انسان کی موت بہت سے سوالات کو جنم دیتی ہے۔ بعض اوقات تو سوالات کی نوعیت سے کچھ ایسا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ شخص تو مر ہی نہیں سکتا تھا، اسے تو مرنا ہی نہیں چاہئے تھا، وہ بھلا کیسے مر سکتا ہے؟

اس کے علاوہ، ایسے انسان کی موت کے بارے میں خیال آرائیاں اور قیاس آرائیاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ مینا کماری کی موت پر بھی قیاس آرائیاں اور تبصرے ہوئے۔ اس رات، اس پارٹی میں، اس بنگلے کے لان پر حاضرین میں جو تبصرے ہوئے، وہی کم و بیش بعد میں پورے ملک میں ہوئے۔ کچھ نے کہا، مینا کماری اپنی زندگی سے ناخوش تھی، کچھ نے کہا کہ دنیا میں اس کا کوئی دوست اور ہمدرد نہیں تھا، کسی نے کہا، اسے زیادہ شراب نوشی نے مار دیا، کسی کو افسوس تھا کہ اس بے چاری کو زندگی میں سچی محبت نہیں ملی۔ کسی کا خیال تھا کہ اسے محبت کے نام پر دھوکا دیا گیا۔ سب سے زیادہ جس نکتے پر اتفاق کیا گیا، وہ یہ تھا کہ اس کا مر جانا ہی بہتر تھا۔ اس بے چاری کو زندگی نے دیا ہی کیا تھا جو وہ مزید زندہ رہتی؟ اس دنیا کی نسبت وہ دوسری دنیا میں زیادہ خوش ہو گی۔ افسوس، کہ مینا کماری اب خود نہیں بتا سکتی تھی کہ ان سب میں سے کون سی بات درست تھی۔

اس وقت تک ذرائع ابلاغ سے مینا کماری کے انتقال کی خبر نشر ہونے لگی تھی۔ ''آل انڈیا ریڈیو'' نے اپنے نو بجے رات کے بلیٹن میں ان الفاظ سے اس خبر کا آغاز کیا ''معروف فلم اسٹار مینا کماری آج شام انتقال کر گئیں...'' دوسری صبح ''ٹائمز آف انڈیا'' نے نہایت کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مینا کماری کے انتقال کی خبر، ان کی بڑی سی تصویر اور جلی سرخی کے ساتھ صفحۂ اوّل پر شائع کی۔ ''ہندوستان ٹائمز'' اور ''اسٹیٹس مین'' نے بھی یہ خبر نمایاں طور پر شائع کی۔ ''نیشنل ہیرالڈ'' کے صفحۂ اوّل پر تیسری بڑی سرخی اسی خبر کی تھی اور مینا کماری کی موت کا تذکرہ بڑے پر سوز انداز میں کیا گیا تھا۔

صرف روزنامہ ''ہندو'' نے مینا کماری کے انتقال کی خبر دیتے وقت آخر میں یہ اضافہ ضروری سمجھا ''مرحومہ مینا کماری مسلمان تھیں جنہوں نے اداکارہ بننے کے بعد ہندوانہ نام رکھ لیا تھا۔'' اس اخبار نے یہ خبر اپنے صفحہ نمبر 7 پر شائع کی تھی۔

ان اخبارات کے علاوہ 'ٹریبیون'، 'پیٹریاٹ'، 'امرت بازار پتریکا'، 'انڈین ایکسپریس' اور 'آسام ٹریبیون' نے بھی مینا کماری کے انتقال کی خبر نمایاں انداز میں شائع کی۔ مینا کماری کی زندگی میں ان کا تذکرہ اخبارات کے صفحۂ اوّل پر شاید ہی کبھی آیا ہو لیکن ان کے انتقال کی خبر نے تقریباً سبھی اخبارات میں پہلے صفحے پر جگہ پائی۔

جن سنیما ہالز میں فلم ''پاکیزہ'' چل رہی تھی، انہوں نے جلدی جلدی اس خبر کی سلائیڈز تیار کروا کے، فلم روک کر اسکرین پر چلائیں۔ فلمی ناظرین مینا کماری کے انتقال کی خبر سے آگاہ ہوئے تو ان میں ایک عجیب سے ہلچل مچ گئی۔ ان کے رد عمل میں بے یقینی، حیرت اور دکھ تھا تاہم جو فلم وہ دیکھ رہے تھے، اس کی ہیروئن کے انتقال کی خبر پڑھ کر اور سن کر ان کی نظر میں فلم کی کچھ اور ہی نوعیت ہو گئی اور اسے دیکھنے کے سلسلے میں گویا ان کا زاویہ نظر ہی بدل گیا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ اس خبر کی وجہ سے فلم کی اہمیت اور لوگوں کی اس میں دلچسپی یکایک بہت زیادہ بڑھ گئی۔

مراٹھا مندر، جو ممبئی کا ایک نہایت معیاری سنیما ہاؤس سمجھا جاتا ہے، اس نے مینا کماری کی موت کے سوگ میں ''پاکیزہ'' کا اپنا آخری شو کینسل کر دیا لیکن لکھنؤ کے مے فیئر سنیما والوں نے رنج و غم کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اس فلسفے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا کہ دنیا کے کام تو چلتے رہتے ہیں، چنانچہ اس سنیما ہاؤس میں ''پاکیزہ'' چلتی رہی۔

حیدر آباد دکن میں ایک سنیما ہاؤس نے ''پاکیزہ'' کا شو شروع ہونے سے پہلے مینا کماری کی موت کی خبر پر مشتمل ایک بڑا سا پوسٹر باہر لگا دیا جس کے بعد فلم پر اس قدر رش ہوا کہ ٹکٹ بلیک ہونے لگے۔ دہلی کے ریوالی سنیما میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو ٹکٹ نہیں مل سکے تو وہ ایک عجیب سی افسردگی کے عالم میں سنیما ہاؤس کے باہر ہی کھڑے رہے، حالانکہ وہ فلم کا آخری شو تھا، اب تو وہ دوسرے دن ہی ''پاکیزہ'' دیکھ سکتے تھے لیکن شاید وہ تصور ہی تصور میں مینا کماری کو سنیما اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔

ممبئی کے پوش، ساحلی علاقے پالی ہل، باندرہ، جوہو، مالا بار ہل وغیرہ، جہاں زیادہ تر فلم اسٹارز کی رہائش تھی، وہاں کا ماحول اور فضا سوگوار سی محسوس ہونے لگی تھی۔ تقریباً تمام فلم اسٹوڈیوز میں، مینا کماری کے انتقال کی خبر پہنچنے کے بعد شوٹنگز کینسل کر دی گئی تھیں۔ ''اجنتا آرٹس ویلفیئر'' کے نام سے کام کرنے والا ایک ثقافتی طائفہ، جس میں سنیل دت، مکیش، سونیا ساہنی وغیرہ شامل تھے، ان کی طرف سے ایک اخبار کو ٹیلی گرام موصول ہوا ''ہم یہاں جموں میں فوجی جوانوں کی فیملیز کے لئے ایک شو پیش کر رہے تھے جب مینا کماری جی کے انتقال کی خبر ہم تک پہنچی۔ ہمیں تو جو صدمہ پہنچا، وہ اپنی جگہ ہے لیکن ہم نے جب یہ خبر حاضرین کو سنائی تو ان میں بہت سے لوگ رونے لگے، ہم نے مینا جی کے غم میں ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی اور شو روک دیا۔''

یش چوپڑا کے بڑے بھائی، فلم ساز اور ہدایت کار بی آر چوپڑا نے ان الفاظ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا ''مینا کماری کی موت کے ساتھ ہم اس عہد کے خاتمے کے قریب آگئے ہیں جس میں فن کے لئے زندگیاں وقف کر دینے والے بڑے فنکار موجود تھے۔''

ستیہ جیت رے نے یوں اظہار خیال کیا ''میں نے مینا کماری کی زیادہ فلمیں تو نہیں دیکھیں لیکن ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ لگانے کے لئے مجھے ''صاحب بی بی اور غلام'' ہی کافی لگی۔ بلاشبہ وہ بہت اعلیٰ درجے کی فنکارہ تھیں۔''

راجندر کمار کے خیال میں مینا کماری جذبات کا سمندر اور شاندار انسانی اقدار کا خزانہ تھیں۔ اداکارہ نرگس کے خیال میں مینا کماری میں ایک خاص نسوانی وقار اور دلکشی موجود تھی۔ ریکھا نے مینا کماری کی موت کی خبر اسٹوڈیو میں سنی۔ وہ اس قدر روئیں کہ ان کی حالت غیر ہو گئی۔ انہیں فوری طور پر گھر بھیج دیا گیا۔ ''انڈیا موشن پکچرز کارپوریشن'' کے چیئرمین مسٹر طارق کو اس خبر سے کچھ ایسا صدمہ پہنچا کہ ان کے، اسپتال میں داخل ہونے کی نوبت آگئی۔ راج کپور اس وقت امریکا میں تھے۔ انہوں نے ایک طویل ٹیلی گرام بھیجا جو مینا کماری کی تدفین کے دوران قبرستان میں وصول کیا گیا۔ دلیپ کمار نے مینا کماری کے انتقال پر ان الفاظ میں اپنے دکھ کا اظہار کیا۔ ''31، مارچ 1972ء ہمیں ایک سیاہ اور الم انگیز دن کے طور پر یاد رہے گا، اس روز ہماری آنکھوں کے سامنے ہماری ایک بہت اچھی دوست بے بسی سے موت کی آغوش میں چلی گئی۔''

(جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
زندگی کا ابتدائی دور ایک تنگ و تاریک
غربت زدہ
کمرے میں گزارا

زندگی کا ابتدائی دور ایک تنگ و تاریک غربت زدہ کمرے میں گزارا

قسط:2

دیو آنند نے مینا کماری کے انتقال پر ان الفاظ میں اپنے محسوسات بیان کئے "وہ اپنے دور کی سب سے بڑی فنکارہ تھیں لیکن مجھے افسوس رہے گا کہ ان کی فنی صلاحیتوں کو پہچانا نہیں جا سکا اور انہیں اپنی زندگی میں وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جس کی وہ مستحق تھیں۔" راج کمار کا خیال تھا کہ اپنے فن کی وجہ سے مینا کماری کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ دھرمیندر کا کہنا تھا کہ میں نے ان کے ساتھ متعدد فلموں میں کام کرکے بہت کچھ سیکھا۔ مجھے نہیں لگتا کہ مستقبل میں کوئی ایسی اداکارہ سامنے آسکے گی جسے ہم مینا کماری کی متبادل کہہ سکیں۔ ان کی موت ایک المیہ ہے لیکن ان کی زندگی اس سے بھی بڑا المیہ تھی۔

بے مثال شاعر ساحر لدھیانوی نے مینا کماری کے بارے میں ذرا مختلف اور منفرد انداز میں اظہار خیال کیا۔ انہوں نے کہا "ان جیسی فنکارانہ صلاحیتیں بہت کم اداکاراؤں میں پائی جاتی ہیں۔ سفید لباس میں وہ سادگی اور پاکیزگی کا پیکر دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے اندر ایک شاعر کی روح مقید تھی۔ انہیں اپنا بچپن قربان کرکے کم عمری میں ہی کیمرے کے سامنے کام شروع کرنا پڑا۔ ان کی جوانی کسی بھی مشرقی عورت کی زندگی میں آنے والے المیوں کی عکاسی کرتے گزر گئی اور اداکاری کے پیچھے ان کی اپنی حقیقی زندگی کے المیے چھپ کر رہ گئے۔ اپنے فن کے ذریعے کروڑوں لوگوں کے دکھوں کی عکاسی کرنے اور ان کے المیوں میں شریک ہونے کے لئے انہوں نے اپنے دکھوں کو پس پشت ڈال دیا۔ بے رحم تقدیر نے انہیں حالات کی سولی پر چڑھا دیا۔"

فلمی رسالوں اور اخباروں میں مینا کماری کے انتقال پر درجنوں مضامین چھپے جن میں مختلف نامور صحافیوں نے اپنے اپنے انداز میں ان کی زندگی اور فن کا تجزیہ کیا۔ کسی نے لکھا، اداکاری ان کی زندگی تھی، وہ اداکاری اسی طرح فطری انداز میں کرتی تھیں جیسے ہم سانس لیتے ہیں۔ کسی نے لکھا، بڑے بڑے قد آور فنکار یکے بعد دیگرے رخصت ہو رہے ہیں اور بونے ان کی جگہ لے رہے ہیں۔ خواجہ احمد عباس نے کئی اخباروں اور رسالوں میں مینا کماری کے بارے میں مضامین لکھے۔ ایک مضمون میں انہوں نے لکھا "دوسرے سب انسانوں کی طرح مینا کماری کا جسم توفانی تھا، قبر کی مٹی دھیرے دھیرے اسے کھا جائے گی لیکن اس کی روح، اس کا فن کبھی فنا نہیں ہو سکے گا۔"

"فلم فیئر" کے اس وقت کے ایڈیٹر بی۔ کے کرنجیا نے اپنے مضمون میں لکھا "مینا کماری نے اپنی زندگی میں بہت دولت کمائی لیکن ضائع کردی۔ اس نے محبت بھی بہت کمائی لیکن وہ بھی گنوادی۔" کمال امروہی نے اپنی مرحومہ بیوی کے بارے میں لکھتے وقت سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی اداکاری یا فنی مقام کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اس کے بجائے انہوں نے اپنے ذاتی محسوسات یوں بیان کئے۔ "لوگوں نے ایک بار میری منجو (مینا کماری کی عرفیت یا نِک نیم) کو اس وقت مجھ سے چھینا تھا جب انہوں نے اس کا نام مینا کماری رکھا تھا۔ اب دوسری بار موت نے اسے صرف مجھ سے ہی نہیں، سب لوگوں سے چھین لیا ہے لیکن مجھے معلوم ہے، وہ مری نہیں ہے۔ وہ میرے دل میں ابدی نیند سو رہی ہے۔"

مینا کماری کی موت کے بارے میں ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والی معروف اور ممتاز شخصیات نے اتنا کچھ کہا ہے، اتنا کچھ لکھا ہے کہ نہایت اختصار سے بھی اس کا جائزہ لینے کے لئے بہت سے صفحات درکار ہیں۔ اس لئے ہم موت سے زندگی کی طرف آتے ہیں، جس کی موت پر اتنا کچھ لکھا گیا، آیئے اس کی زندگی پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

ممبئی کے دادر ریلوے اسٹیشن سے دائیں طرف مڑیں اور چند منٹ چلتے رہیں تو آپ ایک پر ہجوم بازار سے گزرنے کے بعد جس سڑک پر پہنچیں گے وہ دادا صاحب پھالکے روڈ کہلاتی ہے۔ اس سڑک کے دونوں طرف موجود مکانات، عمارتیں اور دکانیں سب خستہ حال اور پرانی ہیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ حکومت کے "غریبی ہٹاؤ" والے نعرے کے پچاس سال بعد بھی ان کی حالت یہی رہے گی یا پھر شاید اس سے بھی بدتر ہو چکی ہو گی۔ یہاں کی دکانوں پر لسی سے لے کر لنگی (دھوتی) تک، سب کچھ ملتا ہے۔

یہاں دائیں طرف ایک بے ڈھنگی سی دو منزلہ عمارت ہے، جس کے گراؤنڈ فلور پر دکانیں اور بالائی منزل پر صرف ایک دروازے اور ایک کھڑکی والے رہائشی کمرے ہیں۔ ممبئی میں اس قسم کے کمروں کو "چال" کہا جاتا ہے۔ ایسے بعض کمروں میں پانچ سات افراد پر مشتمل کنبے بھی رہتے ہیں۔ اس عمارت کے ایسے ہی ایک کمرے میں کبھی مینا کماری بھی رہتی تھی۔ وہ عورت جس کا شمار بعد میں انڈیا کی سب سے زیادہ مشہور اور دولت مند خواتین میں ہوا، اس نے اپنی زندگی کا ابتدائی دور اس تنگ و تاریک اور غربت زدہ کمرے میں گزارا تھا۔ آج بھی اگر کوئی اس سڑک پر جا کر، کسی بچے سے بھی پوچھے کہ مینا کماری کہاں رہتی تھی، تو وہ ایک نیم شکستہ کھڑکی کی طرف اشارہ کر دے گا۔

اس عمارت کے قریب ہی مسلم بچوں کے لئے ایک بڑا سا یتیم خانہ ہے اور مینا کماری کے کمرے کے عین نیچے ایک دکان ہے، جس پر بورڈ لگا ہے۔ "انگریزی اور انڈین انڈے" اس میں انگریزی انڈوں سے مراد، پولٹری فارم کے انڈے ہیں۔ اس عمارت کے مقابل، چھوٹا سا ایک غیر معروف فلم اسٹوڈیو ہے جہاں چھوٹی موٹی غیر اہم سی فلمیں بنتی ہیں۔ کبھی کبھار کوئی صحافی یا مضمون نگار، کیمرے سمیت یہاں آتا رہتا ہے اور اس کمرے کی تصویریں کھینچتا ہے جس میں مینا کماری کا بچپن گزرا۔

مینا کماری نے ڈاکٹر گاڈرے اسپتال کے میٹرنٹی وارڈ میں یکم اگست 1932ء کو جنم لیا۔ بعض جگہوں پر ان کی پیدائش کا سن 1933ء درج ہے۔ ان کے والد کا نام ماسٹر علی بخش اور والدہ کا اقبال بیگم تھا۔ مینا کماری کی پیدائش کا سال بس اس اعتبار سے قابل ذکر تھا کہ اس وقت تک پہلی عالمی جنگ کے زخم مندمل ہو چکے تھے، لوگ دوبارہ تفریحات کی طرف متوجہ ہو چکے تھے اور تفریحات سے لطف اندوز ہونے کو اب ہندوستانی معاشرے میں زیادہ تر لوگ ملامت کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔

اس سال امریکا میں، اس وقت کے صدر ہربرٹ ہوور دوبارہ انتخاب لڑنے کے لئے اپنی مہم چلا رہے تھے۔ جب الیکشن ہوا تو وہ روز ویلٹ کے مقابلے میں ہار گئے تھے۔ رچرڈ نکسن اس زمانے میں قانون کے طالب علم تھے۔ بظاہر احمق نظر آنے والے غیر معمولی ذہین انسان چارلی چیپلن اس وقت تیزی سے اپنا مقام بنا رہے تھے۔ کون آئس کریم دنیا میں اسی سال متعارف ہوئی تھی اور اس کی پہلی دکان کھلنے کے بعد پہلے گاہک کے لئے دکاندار کو آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا تھا۔ ہٹلر کا نام اس زمانے میں دھیرے دھیرے سامنے آرہا تھا۔ اسٹالن اپنے حریفوں سے نمٹ رہے تھے۔

ہندوستان میں نہرو، کانگریس کے جانے پہچانے لیڈر بن چکے تھے لیکن انہی دنوں وہ اپنے والد کی موت کے صدمے سے بھی گزرے تھے جبکہ گاندھی جی اور سردار پٹیل جیل میں تھے۔ گلوکار و اداکار سہگل اور کانن بالا فلمی شائقین میں بے پناہ مقبول تھے۔ پرتھوی راج نے ہندوستان کی پہلی بولتی فلم میں کام کیا تھا۔ بیئر کی بوتل اس زمانے میں 28 پیسے کی اور ایک کلو چینی تیس پیسے کی آتی تھی۔ گولڈ فلیک سگریٹ کا ایک پیکٹ دس پیسے کا تھا۔ تھری پیس گرم سوٹ کی سلائی 3 روپے تھی۔

مینا کماری کے والد علی بخش متحدہ پنجاب کے ایک گاؤں بھیرہ میں پیدا ہوئے تھے جہاں بھٹو صاحب کے والد کی زمینیں بھی تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد یہ علاقہ پاکستان کے حصے میں آگیا تھا۔ علی بخش کو لڑکپن سے ہی موسیقی سے دلچسپی تھی۔ ویسے تو انہیں اردو افسانہ نگاری سے بھی شغف تھا لیکن اس میں وہ کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اپنا موسیقی کا شوق پورا کرنے کے لئے وہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر ہارمونیم بجاتے اور مختلف گانوں کی دھنیں انہیں سناتے۔ صرف اس بنا پر ہی وہ بھیرہ نامی اس گاؤں میں خاصے مشہور ہو گئے اور لوگ انہیں "ماسٹر علی بخش" کہہ کر پکارنے لگے۔

ان کے والدین نے ان کی شادی ان کے آبائی گاؤں کی ایک لڑکی سے کر دی، جس سے ان کی تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ (ان میں سے، شمع نامی ایک بیٹی نے بعد میں مینا کماری کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کیا) ماسٹر علی بخش ایک ذہین آدمی تھے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ جس ماحول میں وہ رہ رہے ہیں، وہاں موسیقی میں نام بنانا ان کے لئے شاید کبھی ممکن نہ ہو سکے۔ اس کیلئے انہیں کسی بڑے شہر میں بود و باش اختیار کرنا پڑے گی۔ بہت سوچ بچار کے بعد انہوں نے اپنی بیوی اور تینوں بچیوں کو بھیرہ میں ہی چھوڑا اور خود ممبئی پہنچ گئے جو ان دنوں ممبئی کہلاتا تھا۔ ان کی جیب میں رقم تو کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن دل میں امیدیں بہت تھیں۔

وہ خوش قسمت تھے کہ انہیں ممبئی میں جلد ہی روزگار مل گیا۔ وہ خاموش فلموں کا زمانہ تھا۔ البتہ اسٹیج ڈراموں میں سازندوں کو اسٹیج کے نیچے یا پھر دائیں بائیں کہیں پردے میں چھپا کر بٹھایا جاتا تھا۔ وہ بعض مکالموں یا پھر گانوں کے ساتھ موسیقی دیتے تھے۔ ماسٹر علی بخش انہی سازندوں میں شامل ہو گئے اور ہارمونیم بجانے کے سلسلے میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے لگے۔

جو تھیٹر کمپنیاں ان کی خدمات حاصل کرتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام "کرشن کمپنی" تھا۔ اس کمپنی میں سانولی سلونی سی، مگر نہایت پرکشش ایک بنگالی کرسچین لڑکی بطور ڈانسر ملازم تھی جو ماسٹر علی بخش کے ہارمونیم اور دیگر سازوں کی دھن پر رقص کرتی تھی تو تھیٹر کے تماشائی اس کے جسم کے دلکش نشیب و فراز کے دیوانے دکھائی دیتے تھے۔ ماسٹر علی بخش بھی اس کی دلکشی کے سحر میں گرفتار ہو گئے۔ وہ جب رقص کرتی تو ماسٹر علی بخش کے لئے توجہ اور یکسوئی سے ہارمونیم بجانا مشکل ہو جاتا۔

یہ ڈانسر کلکتہ سے آئی تھی اور اس کا ٹیگور فیملی سے بھی تعلق تھا۔ اس کا نام پربھاوتی تھا۔ اس کی والدہ مشہور زمانہ بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کے چھوٹے بھائی کی بیٹی تھی۔ وہ نوجوانی میں بیوہ ہو گئی اور اس کے حالات خراب ہو گئے۔ اس دوران اس نے عیسائیت قبول کر لی اور میرٹھ چلی گئی۔ یہاں اس نے پیارے لال نامی ایک آدمی سے شادی کر لی، جس سے اس کے ہاں دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے ایک پربھاوتی تھی۔

پربھاوتی صرف تھیٹر کی ڈانسر ہی نہیں بلکہ خاموش فلموں کی ہیروئن بھی تھی۔ ماسٹر علی بخش کے دل میں جب اس خاتون کی محبت نے زیادہ جوش مارا تو وہ ایک روز تنہائی میں اس کے پاس جا پہنچے۔ انہوں نے زیادہ لمبی چوڑی باتیں کرنے یا تفصیل سے اظہار محبت کرنے کی بجائے سیدھی طرح اس خاتون کو شادی کی پیشکش کر دی لیکن ساتھ ہی ایک شرط رکھ دی کہ اسے اپنا مذہب ترک کرکے اسلام قبول کرنا ہو گا۔ پربھاوتی نے نہ صرف شادی کی درخواست قبول کر لی بلکہ وہ اسلام قبول کرنے پر بھی رضامند ہو گئی۔ اس خاتون کے مسلمان ہونے کے بعد ماسٹر علی بخش نے اس کا اسلامی نام اقبال بیگم رکھا۔

دونوں کے جاننے والوں نے جب پربھاوتی کے اسلام قبول کرنے اور ماسٹر علی بخش سے اس کی شادی کی خبر سنی تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بظاہر تو علی بخش میں کوئی ایسی خوبی دکھائی نہ دیتی تھی کہ پربھاوتی جیسی عورت ان سے متاثر ہوتی۔ وہ عام سی شکل و صورت کے خشک مزاج سے آدمی تھے۔ لچھے دار باتیں کرنی انہیں نہیں آتی تھیں۔ شیروانی اور ڈھیلا ڈھالا پاجامہ پہنتے تھے۔ مالی حیثیت بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ بس، گزر اوقات آسانی سے کر لیتے تھے۔ آخر کار لوگوں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ پربھاوتی شاید ان کی اس خوبی سے متاثر ہوئی تھی کہ فن موسیقی پر انہیں کسی حد تک عبور حاصل تھا۔

(جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات

قسط:3

1920ء کی دہائی میں اسٹیج اور فلم کے پیشہ ور فنکاروں کے لئے زندگی آسان نہیں تھی۔ایک تو تھیٹر یا فلم میں کام کرنے والوں کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔دوسرے ان کی آمدنی بھی کچھ اتنی زیادہ نہیں تھی۔چنانچہ ماسٹر علی بخش اور اقبال بیگم محنت اور باقاعدگی سے کام کرنے کے باوجود زیادہ خوشحال نہیں تھے۔بس گزر بسر آرام سے ہو رہی تھی اور ان کے فن کے قدر دانوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ بھی موجود تھا۔ماسٹر علی بخش کو ''بابو جی'' کی عرفیت سے بھی پکارا جاتا تھا۔

اقبال بیگم سے ماسٹر علی بخش کی تین بیٹیاں پیدا ہوئیں، جن کے نام بالترتیب خورشید، ماہ جبیں اور مدھو تھے۔تیسری بیٹی کی پیدائش علی بخش کے لئے خاصی مایوسی کا باعث تھی، کیونکہ اس بار وہ کچھ زیادہ ہی شدت سے، اپنے ہاں بیٹے کی پیدائش کی امید لگائے بیٹھے تھے۔مایوسی انہیں پہلی اور دوسری بیٹی کی پیدائش پر بھی ہوئی تھی۔بہرحال انہیں لوگوں نے سمجھایا اور تسلی دی کہ اولاد لڑکا ہو یا لڑکی، اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔لوگوں کے سمجھانے بجھانے پر ان کی مایوسی کافی حد تک دور ہو گئی۔

جب ان کے ہاں منجھلی بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام رکھنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی تھی، کیونکہ وہ جب چند دن کی ہوئی تو اس کی خوبصورتی نمایاں ہونے لگی تھی۔اس کا چہرہ ننھے سے چاند کی طرح دمکتا دکھائی دینے لگا تھا۔کسی نے اس بچی کا نام ماہ جبیں تجویز کر دیا، جس کا مطلب ہے ''وہ... جس کی پیشانی چاند کی طرح چمکتی ہو۔'' سب نے بچی کے اس نام کو پسند کیا۔اس دن سے اسے ماہ جبیں کہہ کر پکارا جانے لگا۔علی بخش کی بڑی بیٹی چند سال کی ہوئی تو فلموں میں چائلڈ اسٹار کے طور پر کام کرنے لگی۔اسے ملنے والے قلیل سے معاوضے سے گھر کی معیشت کو سہارا ملا۔روزمرہ اخراجات پورے کرنے میں کچھ آسانی ہو گئی۔

سکون اور قناعت سے زندگی گزارتے ہوئے اس گھرانے کے لئے 1935ء میں مشکلات کا آغاز ہو گیا۔وہ یوں کہ علی بخش کو کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی جس میں وہ روز بروز کمزور ہونے لگے۔ان کا جسم تیزی سے گھلتا جا رہا تھا اور ان کی بیماری کسی ڈاکٹر کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔کسی نے مشورہ دیا کہ انہیں آرام اور علاج کے لئے لاہور چلے جانا چاہئے، وہاں ان کی صحت یابی کی زیادہ امید رکھی جا سکتی تھی۔یہ بات علی بخش کے دل کو لگی لیکن انہوں نے اکیلے نہیں، بلکہ پوری فیملی نے ہی لاہور کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔

ماہ جبیں اس وقت تین سال کی تھی۔اس عمر میں اس نے پہلی بار ٹرین کا سفر کیا۔ٹرین ایک دریا کے پل سے گزری تو ماہ جبیں اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ چیخیں مار کر رونے لگی۔اسے لگ رہا تھا کہ تمام مسافروں سمیت ٹرین دریا میں جا گرے گی۔اس نے کھڑکی بند کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کھڑکی کا، اوپر کی طرف سے نیچے آنے والا بھاری پٹ اتنے زور سے اس کے ہاتھ پر گرا کہ شدید چوٹ لگی۔کچھ چوٹ کی تکلیف اور کچھ ذہن پر خوف کا شدید حملہ... ان دونوں کے اثر سے ننھی ماہ جبیں بے ہوش ہو گئی۔

ہوش میں آنے پر اس کے لئے سب سے زیادہ اطمینان کی بات یہ تھی کہ ٹرین بہ خیر و عافیت دریا عبور کر چکی تھی۔وہ سب لاہور پہنچ گئے جہاں بابو جی کی صحت نہایت سست رفتاری سے بہتر ہونے لگی۔ایک سال لاہور میں گزار کر وہ اس قابل تو ہو گئے کہ ممبئی واپس آ سکیں، لیکن ان کے پاس زندگی بھر کی جو بھی جمع پونجی یا بیوی کے زیورات وغیرہ تھے، وہ سب ٹھکانے لگ چکے تھے۔وہ ممبئی واپس آئے تو بالکل قلاش تھے۔اب گویا انہیں نئے سرے سے زندگی کا سفر شروع کرنا تھا۔

کہتے ہیں مصیبت تنہا نہیں آتی۔بابو جی کسی حد تک صحت یاب ہو کر واپس آئے تو اقبال بیگم بیمار رہنے لگیں۔وہ دوبارہ اسٹیج پر پاؤں جمانے کی کوشش کر رہی تھیں، لیکن اس کے ساتھ علاج معالجے اور ٹیسٹوں وغیرہ کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔کافی عرصے بعد جا کر یہ تشخیص ہوئی کہ انہیں پھیپھڑوں کی کوئی خاص انفیکشن بیمار کر رہی ہے۔یہ معلوم ہونے اور طبیعت اکثر ناساز رہنے کے باوجود اقبال بیگم فلم اور تھیٹر میں کام حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی رہیں، لیکن اس دوران ایک اور ایسا واقعہ ہوا جس نے انہیں انتہائی دل شکستہ کر دیا۔

ان دنوں ان کی سب سے بڑی بیٹی خورشید کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔بات تقریباً طے ہو چکی تھی کہ کسی نے لڑکے والوں کو گویا یاد دلا دیا کہ لڑکی بے شک خوبصورت ہے، لیکن اس کی ماں اسٹیج اور فلموں کی ایکٹریس اور ڈانسر ہے۔لڑکے والے بدک گئے۔اس زمانے میں تھیٹر اور فلم میں کام کرنا کافی حد تک معیوب سمجھا جاتا تھا۔لڑکے والوں نے رشتے کی بات ختم کر دی۔اقبال بیگم کے دل پر اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ اپنی بچیوں کے مستقبل کے لئے انہوں نے اپنے کیریئر کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کر لیا۔یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے اس فیصلے میں ان کی گرتی ہوئی صحت کا بھی کچھ نہ کچھ دخل رہا ہو۔

جب اقبال بیگم بالکل ہی بستر کی ہو کر رہ گئیں تو ماسٹر علی بخش نے ان کی تیمارداری اور گھرداری کے فرائض سنبھال لئے۔ان کی بڑی بیٹی خورشید، فلم اسٹوڈیوز میں کام کر کے تھوڑی بہت آمدنی کا ذریعہ بنی ہوئی تھی لیکن گھر چلانے اور سب کا پیٹ پالنے کے لئے یہ آمدنی کافی نہیں تھی۔چنانچہ ماسٹر علی بخش نے فیصلہ کیا کہ اگر ان کی دونوں چھوٹی بیٹیاں بھی کچھ کما کر لانے لگ جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔وہ گھر میں یا گھر کے آس پاس لڑکیوں کے کھیلنے کودنے کے بھی حق میں نہیں تھے اور ان کے خیال میں لڑکیوں کے لئے زیادہ تعلیم ضروری نہیں تھی، معمولی تعلیم بھی ان کے لئے کافی تھی۔

ویسے بھی ماسٹر علی بخش بیٹیوں کے معاملے میں کچھ زیادہ جذباتی آدمی نہیں تھے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ مجموعی طور پر ہی ان میں جذبات کی خاصی کمی تھی۔وہ ایک روکھے، خشک اور غیر جذباتی آدمی تھے۔بیٹیوں کی زندگی میں محبت کی کمی ان کی والدہ پوری کرتی تھیں۔کمسن ماہ جبیں ان دنوں گلی میں کھیلتی کودتی پھرا کرتی تھی۔اسی سڑک پر واقع ایک عمارت کے بارے میں اسے بڑا تجسس ہوا کرتا تھا۔اس عمارت کا نام ''روپ تارا اسٹوڈیو'' تھا۔یہ عمارت ایک کشادہ احاطے اور چاردیواری کے اندر تھی۔ماہ جبیں دن بھر کے دوران بہت سی گاڑیاں اس عمارت کی چاردیواری میں داخل ہوتے اور کبھی باہر جاتے دیکھتی، جس سے اسے اندازہ ہوتا کہ کوئی عام سی نہیں، بلکہ خاص جگہ تھی۔

ایک روز تجسس سے مجبور ہو کر ننھی ماہ جبیں نے ''روپ تارا اسٹوڈیو'' میں گھسنے کی کوشش کی لیکن موٹی موٹی مونچھوں والے ایک پٹھان چوکیدار نے اسے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ننھی ماہ جبیں اس عمر میں ہی ذہین اور ہوشیار تھی۔اس کے ذہن میں اس رکاوٹ کو عبور کرنے کا ایک طریقہ آ گیا۔اس نے قریبی دکان سے چند پیسوں کے گرما گرم پکوڑے خریدے اور لفافہ لے جا کر خاموشی سے چوکیدار کی طرف بڑھا دیا، چوکیدار نے لفافے میں جھانک کر پکوڑوں کو دیکھا، پھر جھجکتے ہوئے لفافہ ہاتھ میں لیا تو اسے احساس ہوا کہ پکوڑے گرما گرم تھے۔

اس نے محتاط نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کیا کہ کوئی اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔پھر وہ بچی کی معصوم سی شکل دیکھ کر مسکرا دیا۔اس نے بچی کے گال تھپتھپائے، پھر اسے گود میں اٹھا کر خود اندر لے گیا اور اسٹوڈیو کے لان پر چھوڑ دیا۔اس دن کے بعد سے پکوڑوں کی ''رشوت'' بھی ضروری نہ رہی۔ننھی ماہ جبیں اسٹوڈیو کے گیٹ پر پہنچتی تو چوکیدار کسی اور طرف دیکھنے لگ جاتا، ماہ جبیں اندر چلی جاتی اور چوکیدار یہی ظاہر کرتا جیسے اسے پتا ہی نہیں ہے کہ کوئی بچی اس کی نظر بچا کر اندر چلی گئی ہے۔

اس دوران ماہ جبیں کے والد نے اسے خود بھی اپنے ساتھ لے کر اسٹوڈیوز جانا شروع کر دیا۔وہ کسی نہ کسی طرح ہر اسٹوڈیو کے مالک سے ملتے اور نہایت عاجزانہ لہجے میں، رٹے رٹائے سے انداز میں کہتے ''جنابِ والا! یہ بچی بڑی باصلاحیت ہے، آپ کو کسی نہ کسی فلم میں ننھے فنکاروں کی ضرورت تو پڑتی ہو گی، اگر آئندہ کسی بچی کی ضرورت پڑے تو اسے ضرور یاد رکھیئے گا...''

اس زمانے میں تقریباً تمام اسٹوڈیو مالکان، فلم پروڈیوسر بھی ہوتے تھے۔وہ علی بخش کو تسلی دے کر واپس بھیج دیتے۔ایک دن علی بخش کی یہ کوششیں رنگ لے ہی آئیں۔پرکاش اسٹوڈیو کے مالک، پروڈیوسر اور ڈائریکٹر وجے بھٹ نے علی بخش سے کہا کہ وہ دوسرے روز اپنی بیٹی کو لے کر اسٹوڈیو آ جائے۔وجے بھٹ اس زمانے میں ''لیدر فیس'' کے نام سے ایک فلم بنا رہے تھے جس کے ہیرو جے راج اور ہیروئن مہتاب تھیں۔جے راج کی کمسن بیٹی کے کردار کے لئے وجے بھٹ کو ایک بچی کی ضرورت تھی اور انہیں اس کردار کے لئے ماہ جبیں موزوں دکھائی دی تھی۔

دوسرے روز علی بخش نے اپنی بیٹی کو صبح سویرے ہی جگا دیا اور اسے اس کے سب سے اچھے اور صاف ستھرے کپڑے پہنا کر، تیار کر کے اپنے ساتھ پرکاش اسٹوڈیو لے گئے۔اس روز اس سین کی شوٹنگ کے لئے تیاریاں مکمل تھیں، جس میں بچی کو کام کرنا تھا۔ماہ جبیں نے اپنی تمام تر کم عمری اور اداکاری سے ناواقف ہونے کے باوجود اس طرح اپنا کام مکمل کرایا جیسے وہ پیدائشی اداکارہ تھی۔وہ فلمی سیٹ کے ماحول، کیمرے اور وہاں موجود افراد کو دیکھ کر ذرا بھی نہیں گھبرائی جس پر وجے بھٹ بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ آئندہ انہیں جب بھی کسی فلم میں بچی کی ضرورت پڑی تو وہ اسی کو بلوائیں گے کیونکہ اس سے کام لینے اور سین شوٹ کرنے میں انہیں ذرا بھی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

شوٹنگ ختم ہوئی تو ماہ جبیں کو 25 روپے معاوضہ ملا جو صرف اس کے لئے ہی نہیں بلکہ علی بخش کے لئے بھی ایک بڑی رقم تھی۔

اس دن سے بطور چائلڈ آرٹسٹ، ماہ جبیں کا فلمی دنیا میں کیریئر شروع ہو گیا۔اگلے چار سالوں میں اس بچی نے ''ادھوری کہانی''، ''پوجا''، ''روشنی''، ''بہن''، ''وجے''، ''کسوٹی'' اور ''غریب'' میں کام کیا۔یہ تقریباً سبھی فلمیں وجے بھٹ کی تھیں۔ان کی شوٹنگ کے لئے کمسن ماہ جبیں روزانہ گھر سے نکل کر 'ریل' کے علاقے میں پہنچتی، جہاں وجے بھٹ کا آفس واقع تھا، وہاں سے وجے بھٹ کی گاڑی میں ماہ جبیں کو اسٹوڈیو لے جایا جاتا جو 'اندھیری' کے علاقے میں تھا۔

اس وقت تک ماہ جبیں کے معاوضے میں بھی اضافہ ہو چکا تھا، جس سے گھر کے مالی مسائل کافی حد تک حل ہو گئے تھے۔1962ء میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے مینا کماری نے کہا تھا ''مجھے یہ سوچ کر طمانیت محسوس ہوتی ہے کہ میں نے چار سال کی عمر سے گھر کے لئے پیسہ کمانا شروع کر دیا تھا، تاہم جب میں والد کی انگلی تھام کر اسٹوڈیو کے لئے روانہ ہوئی تھی تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ فلموں میں کام کرنا ہمیشہ کے لئے میرا مقدر رہو گا۔میں تو سمجھی تھی کہ یہ تھوڑے دنوں کا کوئی کام ہے، جب یہ ختم ہو جائے گا تو مجھے بھی دوسرے بچوں کی طرح اسکول میں داخل کرا دیا جائے گا۔میں بھی لکھوں گی، پڑھوں گی، فارغ وقت میں کھیلا کودا کروں گی... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔مجھ پر شاید بچپن کبھی آیا ہی نہیں... یا پھر شاید حالات نے میرا بچپن مجھ سے چھین لیا۔''

درحقیقت ماہ جبیں کو اسکول میں داخل تو کرایا گیا تھا لیکن اپنی شوٹنگ کی مصروفیات کی وجہ سے وہ باقاعدگی سے اسکول نہیں جا پاتی تھی۔چنانچہ اس نے زندگی میں جتنی بھی تعلیم حاصل کی، وہ پرائیویٹ ٹیوشن یا پھر اس کے ذاتی شوق کی رہینِ منت تھی۔یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ مینا کماری خود ہی اپنی استاد یا معلم تھیں۔ان کی زیادہ توجہ اردو پر رہی، اس لئے اردو لکھنے پڑھنے اور بولنے پر تو انہوں نے عبور حاصل کر لیا تھا۔گزارے لائق انگریزی بھی بول لیتی تھیں لیکن ان کے پاس کسی تعلیمی ادارے کی کوئی باقاعدہ سند یا ڈگری موجود نہیں تھی۔

(جاری ہے)

itsurdu.blogspot.com
Ardhangini
اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
انہیں بچپن سے ہی
کتابوں سے دلچسپی تھی
itsurdu.blogspot.com

انہیں بچپن سے ہی کتابوں سے دلچسپی تھی

قسط:4

بچپن میں جو بھی بچّے ماہ جبیں کے دوست بنے، وہ اسٹوڈیو میں ہی بنے۔ وہ بچّے بھی چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر کام کرنے یا ویسے ہی کسی کے ساتھ اسٹوڈیو آتے تھے۔ اِن میں سے دو بچوں سے، خاص طور پر ماہ جبیں کی زیادہ دوستی رہی۔ ایک بچی ککو تھی جو آگے چل کر فلموں کی ایک مشہور ڈانسنگ اسٹار بنی۔ دُوسرا بچہ سریش تھا جو آگے چل کر ہیرو بنا۔

مینا کماری نے بعد میں ایک انٹرویو میں سریش کے بچپن اور لڑکپن کا ذکر کرتے ہوئے کہا ”اس زمانے میں وہ بڑا اشر میلا سا ہوا کرتا تھا اور بہت خراب سے کپڑے پہن کر اسٹوڈیو آتا تھا۔“

ایک اور بچی سے بھی ماہ جبیں کی شناسائی رہی جو بے بی ممتاز کہلاتی تھی۔ آگے چل کر اس بچی نے مدھو بالا کے نام سے فلمی دُنیا میں بڑا مقام حاصل کیا۔

گو کہ پہلے ہی دن سے ماہ جبیں کو فلموں میں کام کرنا مشکل نہیں لگا تھا لیکن اس کا ننھا سا ذہن فلمی دُنیا کو سمجھنے سے بہر حال قاصر تھا۔ اپنی پہلی فلم ”لیدر فیس“ میں کام شروع کرتے وقت جب شوٹنگ کے پہلے دن فلم کے ڈائریکٹر نے جے راج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ماہ جبیں کو بتایا کہ وہ اس کے ابو ہیں، تو وہ حیران رہ گئی۔ اس نے علی بخش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”میرے ابو تو وہ ہیں۔“

بہر حال بہت جلد اس کی سمجھ میں آگیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ پھر چودہ سال بعد وہ دن بھی آیا کہ وہی جے راج جو ماہ جبیں کی پہلی فلم میں اس کے ”ابو“ بنے تھے، وہ فلم ”مغرور“ میں اس کے ہیرو بنے۔ تاہم اس وقت تک ماہ جبیں فلمی دُنیا کو کافی اچھی طرح سمجھ چکی تھی۔ اسٹوڈیوز میں شروع سے ہی اس کا یہ معمول رہا کہ جب بھی اسے فارغ وقت میسّر آتا، وہ کسی کونے کھدرے میں بچوں کی کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتی جبکہ دُوسرے بچّے اِدھر اُدھر کھیلنے کودنے چلے جاتے۔ کتابوں سے اس کی دلچسپی دیکھ کر لوگوں نے اسے ”پڑھا کو ماہ جبیں“ کا نام دے دیا تھا۔

1938ء میں ماہ جبیں کی عمر تقریباً چھ سال ہو چکی تھی اور وہ تھوڑی بہت مشہور بھی ہو چکی تھی۔ فلم رائٹر اور ڈائریکٹر کمال امروہی اس وقت شہرت اور کامیابی کے ابتدائی مراحل طے کر رہے تھے اور خاصا نام کما چکے تھے۔ وہ ان دنوں سہراب مودی کی فلم ”جیلر“ ڈائریکٹ کر رہے تھے اور اس کے لیے انہیں سات سال کی ایک بچی کی بھی ضرورت تھی۔ کسی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ جا کر ماسٹر علی بخش سے ملیں، جن کی ایک نہیں، بلکہ تین بیٹیاں تھیں، تینوں فلم میں کام کرتی تھیں اور اس مقصد کے لیے انہیں کسی بھی وقت بلایا جا سکتا تھا۔

کمال امروہی فوراً ہی دادر جا پہنچے جہاں ماسٹر علی بخش رہتے تھے۔ علی بخش نے نہایت عاجزی اور احترام سے کمال امروہی کا استقبال کیا۔ ان کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ تیزی سے اُبھرتا ہوا ایک کامیاب فلم رائٹر اور ڈائریکٹر خود چل کر ان کے گھر آیا تھا۔ کمال امروہی نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو علی بخش نے فوراً اپنی تینوں بیٹیوں کو پکارا۔ ان میں سے ایک تو فوراً ہی، ننگے پاؤں، دوڑی دوڑی کمرے میں آگئی۔ وہ شاید اس وقت کیلا کھا رہی تھی۔ اس کا چہرہ بھی کیلے کے ملغوبے سے لتھڑا ہوا تھا۔ علی بخش نے بیٹی کے اس حلیے پر کمال امروہی سے معذرت کی اور انہیں بتایا کہ منہ دُھونے اور صاف ستھرے کپڑے پہننے کے بعد بچی نہایت معقول دِکھائی دیتی ہے، وہ اس کی موجودہ حالت پر نہ جائیں کیونکہ اچانک بلائے جانے پر، وہ جس حال میں تھی، اسی طرح دوڑی دوڑی چلی آئی ہے۔

کمال امروہی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں مسٹر سہراب مودی سے اس بچی کی سفارش کروں گا۔“

ماہ جبیں کو سہراب مودی کی فلم میں کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اسے منتخب نہ کیے جانے کی کوئی وجہ بھی سامنے نہیں آئی۔ ممکن ہے کمال امروہی کو بچی کا، کیلے سے لتھڑا ہوا چہرہ پسند نہ آیا ہو۔ اس وقت شاید انہیں گمان بھی نہ گزرا ہو کہ لتھڑے ہوئے چہرے والی یہی بچی جب جوان ہو گی تو وہ اس کی زلفوں کے اسیر ہو جائیں گے اور وہ لڑکی بھی بُری طرح ان کے عشق میں گرفتار ہو گی۔

اِس دوران ماہ جبیں بدستور فلموں میں کام کرتی رہی۔ جن دنوں وہ فلم ”ایک ہی پھول“ میں کام کر رہی تھی، ڈائریکٹر اور پروڈیوسر وجے بھٹ کو خیال آیا کہ ایک لڑکی کو اگر فلموں میں ایکٹنگ کو ہی اپنا کیریئر بنانا تھا تو اس کے لیے ’ماہ جبیں‘ نام بہت ہی ناموزوں تھا۔ انہوں نے آئندہ کے لیے اس کا نام ”بے بی مینا“ رکھ دیا۔ فلموں میں کام کرنے والی کم عمر لڑکیوں کے نام کے ساتھ ان دنوں ”بے بی“ کا لاحقہ ضرور لگا دیا جاتا تھا۔ علی بخش کو نام کی یہ تبدیلی پسند تو نہیں آئی لیکن وہ وجے بھٹ سے اختلافِ رائے کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ویسے بھی جس فلم انڈسٹری میں ہندوؤں کا راج تھا، وہاں ایک اداکارہ بچی کا مسلمانوں والا نام ”ماہ جبیں“ واقعی کچھ عجیب لگتا تھا۔ ان دنوں مسلمان اداکاروں اور اداکاراؤں کو اپنے نام کے سلسلے میں اکثر مسئلہ درپیش رہتا تھا۔

مینا بھی کوئی اچھا نام تو نہیں تھا، اس میں بھی ایک قسم کی بے کیفی تھی۔ جب تک آگے چل کر اس کے ساتھ ”کماری“ کا اضافہ نہیں ہوا، اس میں ایک خاص قسم کی نغمگی اور روانی نہیں آئی۔ چائلڈ آرٹسٹ عام طور پر، بڑے ہونے کے ساتھ دھیرے دھیرے فلموں سے غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ ظاہر ہے، وہ ہمیشہ تو بچّے نہیں رہ سکتے۔ بیچ میں ایک دور ایسا آتا ہے جب ان کا شمار نہ تو بچوں میں ہوتا ہے اور نہ ہی بڑوں میں۔ زیادہ تر اداکار بچّے اِسی دور میں فلموں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ جب وہ پورے جوان ہوتے ہیں تو ضروری نہیں ہوتا کہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر انہیں کاسٹ کریں۔

1946ء میں جب بے بی مینا چودہ سال کی ہوئی تو اس کی زندگی میں بھی یہ مرحلہ آیا لیکن اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے اس عمر میں بھی ایک فلم ”بچوں کا کھیل“ میں کسی غیر اہم سے کردار کے بجائے مرکزی کردار مل گیا۔ اس فلم کو کاروباری طور پر کوئی خاص کامیابی نہیں ملی لیکن ”بے بی مینا“ کو اس کا ایک خصوصی فائدہ یہ ہوا کہ وہ اس فلم کی وجہ سے اس زمانے کے دو بڑے فلمسازوں کی نظر میں آگئی۔ ان میں سے ایک کیدار شرما تھے اور دُوسرے ہومی واڈیا۔

کیدار شرما ایک فلم پروڈکشن کمپنی ”رنجیت مووی ٹون“ میں ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں بتایا ”ماہ جبیں عرف بے بی مینا“ کی والدہ اقبال بیگم نے بڑی عاجزی سے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اگر ان کی بیٹی کو اپنی سرپرستی میں لے کر، تربیت اور رہنمائی سے اس کی شخصیت کو سنوار کر اور نکھار کر ایک کامیاب اداکارہ بنا دوں تو ان کی فیملی زندگی بھر میری احسان مند رہے گی۔“

کیدار شرما نے اس حد تک ان کی مدد ضرور کی کہ بے بی مینا کو اپنی ایک فلم ”داداجی“ میں کاسٹ کر لیا۔ اس میں مینا کے ساتھ دُوسرے دو اہم کرداروں میں اداکار ’جاگیردار‘ اور الطاف تھے۔ الطاف کی، بعد میں مینا کی سب سے بڑی بہن خورشید سے شادی ہوئی تھی۔ یہ فلم مکمل تو ہو گئی لیکن ایک آتشزدگی میں اس کا نیگیٹو جل گیا۔ اس فلم میں مینا سے کام لینے کے بعد کیدار شرما کی اس کے بارے میں رائے یہ تھی ”وہ ایک بے کشش اور کوڑھ مغز سی لڑکی تھی۔ اس وقت اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایک روز وہ انڈین سینما کی ایک ایسی اداکارہ ہو گی جس کا کوئی ثانی نہیں ہو گا۔“

اس کے برعکس دُوسرے فلم پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہومی واڈیا کی مینا سے ملاقات کے بعد اس کے بارے میں یہ رائے تھی ”مینا سے چند سین کرانے کے بعد ہم سب کو اندازہ ہو گیا کہ یہ لڑکی بہت آگے جائے گی۔ وہ جب ہمارے اسٹوڈیو میں آئی، تبھی سب اس کے بارے میں تجسس سے پوچھنے لگے تھے کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے۔“

علی بخش کی تینوں بیٹیاں فلموں میں کام کر رہی تھیں، اس لیے گھر کے مالی حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے۔ علی بخش نے محسوس کیا کہ اب انہیں گھر بھی بدل لینا چاہیے، چنانچہ 1946ء میں وہ ساحلی علاقے باندرہ میں، جیمبل روڈ پر چھوٹے سے ایک بنگلے میں آگئے جس میں چھوٹا سا ایک لان اور گاڑی کھڑی کرنے کے لیے جگہ بھی تھی، اس گھر کے برابر میں ہی محبوب اسٹوڈیو واقع تھا۔ اپنے پرانے، چھوٹے سے ایک کمرے کے گھر کے مقابلے میں یہ گھر ان سب کے لیے محل سے کم نہیں تھا۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سب سے زیادہ ماہ جبیں عرف مینا خوش تھی۔ اس نے چھوٹے سے لان پر باغبانی شروع کر دی۔ پھولوں اور پودوں سے مینا کی یہ محبت زندگی بھر برقرار رہی۔

علی بخش کا رویّہ بیٹیوں کے ساتھ، ہمیشہ کی طرح خشک اور غیر جذباتی تھا۔ اسے گھر میں بیٹیوں کا کھیلنا، کودنا اور مینا کا پھول پودے اُگانے کا شوق بالکل پسند نہیں تھا۔ اس کے خیال میں یہ صرف وقت ضائع کرنے کے مختلف طریقے تھے۔ ایک بار علی بخش نے مینا کو اس کے شوق کے سلسلے میں ڈانٹ بھی دیا جس پر مینا نے غُصّے میں اپنے گھر کے سامنے والے بنگلے کے گیٹ پر پتھّر مارنے شروع کر دیے۔ اس بنگلے میں موسیقار نوشاد، جنہوں نے آگے چل کر موسیقی کی دُنیا میں بڑا نام پایا، ایک گانے کی دُھن بنانے کی کوشش میں سر کھپا رہے تھے۔

وہ ان دنوں نوجوان تھے اور بطور موسیقار ایک ممتاز مقام حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کر رہے تھے۔ وہ اپنے گھر کے گیٹ پر پتھر لگنے کی مسلسل آوازوں سے بہت ڈسٹرب ہوئے اور انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ پتھر مارنے والی سامنے کے گھر کی ایک لڑکی تھی۔ وہ غصے میں بھنّائے ہوئے آئے اور انہوں نے صاحبِ خانہ ماسٹر علی بخش سے شکایت کی۔ انہوں نے نوشاد سے معذرت کی اور مینا کو اس حرکت پر ایک طمانچہ رسید کیا۔ آنے والے برسوں میں، جب نوشاد اور مینا کماری، دونوں ہی اپنے اپنے شعبے میں فلم انڈسٹری کے بڑے نام بن چکے تھے، نوشاد نے کئی بار شرارت کے طور پر مینا کماری کو یاد دلایا ”وہ وقت بھول گئیں جب میں نے تمہارے ابّا سے تمہاری شکایت کر کے منہ پر زوردار تھپڑ لگوایا تھا؟“

نئے مکان میں آنے کے بعد اقبال بیگم صرف اٹھارہ ماہ زندہ رہیں۔ دراصل انہیں پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا تھا۔ 25 مارچ 1947ء کو ان کا انتقال ہو گیا اور انہیں باندرہ کے ”سُنّی قبرستان“ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ ان کے انتقال کے بعد گھر میں عورت کے فرائض بھی علی بخش کو سنبھالنے پڑے۔ مینا کو اب فلمساز، ہدایتکار اور بسنت اسٹوڈیو کے مالک ہومی واڈیا نے مکمل طور پر اپنی سرپرستی میں لے لیا تھا۔ وہ زیادہ تر دیومالائی اور اسٹنٹ فلمیں بنایا کرتے تھے۔ مینا نے ان کی بیشتر اسٹنٹ فلموں میں کام کیا۔ ان میں زیادہ تر مار دھاڑ اور ہیرو، ہیروئن کے کافی حد تک ناقابلِ یقین سے کارنامے ہوتے تھے۔ ہومی واڈیا کی بیوی نادیہ بھی اسی قسم کی فلموں کی ہیروئن تھیں۔ ان کی ایک فلم کا نام انگریزی میں کچھ اور تھا مگر اُردو میں اسے ”ہنٹر والی“ کا نام دے دیا گیا تھا جس کی وجہ سے نادیہ خود بھی ”نادیہ ہنٹر والی“ کے نام سے مشہور ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے زمانے میں اس قسم کی فلموں کی بڑی مشہور ہیروئن تھیں۔

(جاری ہے)

itsurdu.blogspot.com
چلتے چلتے
27 Feb. - 05 Mar. 2017
اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
وہ شاعروں، ادیبوں میں
کشش محسوس کرتی تھیں
itsurdu.blogspot.com
itsurdu.blogspot.com

وہ شاعروں، ادیبوں میں کشش محسوس کرتی تھیں

قسط:5

بسنت اسٹوڈیو میں مینا نے ہومی واڈیا کی جس پہلی فلم میں کام کیا، اس کا نام ”لکشمی نارائن“ تھا جس میں مینا نے لکشمی دیوی کا رول کیا تھا۔ اس کے بعد مینا نے اس قسم کی کئی فلموں میں متعدد دیویوں کا رول اتنی خوبصورتی اور مہارات سے ادا کیا کہ ان کی شوٹنگ دیکھنے والے بھی حیران رہ جاتے تھے۔ انہیں یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی مہارت اور خوبصورتی سے کسی دیوی کا رول ادا کرنے والی نوعمر لڑکی مسلمان ہے۔ ایک اور دلچسپ حقیقت یہ بھی تھی کہ مینا کو دیویوں اور دیوتاؤں یا ہندوؤں کی دیومالائی کہانیوں کے بارے میں ذرا بھی علم نہیں تھا۔ ایک بار تو ایک معروف وکیل مسٹر ملاویا نے ایک فلمی رسالے میں، کافی غصّے بھرے اور شکایتی سے انداز میں خط بھی لکھ دیا کہ مینا کماری اگر ہندو نہیں ہے تو ہر فلم میں کسی نہ کسی دیوی کا کردار اسی سے کیوں کرایا جاتا ہے؟

کسی کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا کہ مینا کماری کو ہندوانہ قسم کی دیومالائی فلموں میں مختلف دیویوں کے کرداروں میں کیوں کاسٹ کیا جاتا تھا؟ اس سوال کا جواب شاید ایسی فلمیں بنانے والے بھی نہیں دے سکتے تھے۔ ممکن ہے، اس کی وجہ صرف یہ رہی ہو کہ مینا کماری ہر دیوی کے کردار میں خوب بچ جاتی تھیں۔ بہر حال، وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن مینا کماری اور ان کے والد کے لئے یہ فلمیں اس وجہ سے بھی اہم تھیں کہ یہ ان کے گھر کے اخراجات چلانے کا سب سے بڑا ذریعہ تھیں۔

مینا کماری کو اس قسم کی پہلی فلم میں کام کرنے کا معاوضہ 4 ہزار روپے اور آخری فلم ”الہ دین اینڈ دی لیمپ“ میں کام کرنے کا معاوضہ 10 ہزار روپے ملا تھا۔ تاہم ”جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ آخری فلم دیومالائی نہیں بلکہ الف لیلوی اور طلسماتی قسم کی تھی۔ ہومی واڈیا کے ساتھ یہ ان کی آخری فلم تھی اور یہ بے حد کامیاب رہی تھی۔ انہی فلموں کی آمدنی سے مینا کماری کا گھرانہ اس قابل ہوا کہ انہوں نے ایک سیکنڈ ہینڈ ”پلے ماؤتھ“ کار بھی خرید لی۔ ظاہر ہے، اس زمانے میں کسی گھر میں کار کا موجود ہونا ایک قسم کا ”اسٹیٹس سمبل“(status symbol) تھا 1950ء میں مینا کماری کا گھرانہ ایک پوش علاقے میں چھوٹے سے بنگلے میں رہ رہا تھا جس میں کار بھی موجود تھی۔ یہ بلاشبہ ایک بڑی کامیابی تھی جو اس گھرانے کو تینوں بچیوں کی وجہ سے نصیب ہوئی تھی۔ تاہم اس میں سب سے زیادہ حصہ مینا کماری کا تھا۔

مینا کماری نے جلد ہی ڈرائیونگ بھی سیکھ لی اور بہت کم عرصے میں ماہر ڈرائیور بن گئیں۔ انہیں جب بھی موقع ملتا، اپنے اسی نوعمری کے زمانے میں وہ اپنی پرانی سی کار کو باندرہ کی سڑکوں پر دوڑائے پھرتیں۔ اس وقت وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی تھیں اور اس عمر میں جذبات کی دنیا میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، وہ ان سے آشنا ہونے لگی تھیں۔ اب وہ ”بے بی مینا“ نہیں بلکہ صرف ”مینا“ کہلاتی تھیں۔ ایک روز ایک انگریزی فلمی رسالے میں انہوں نے ایک شخص کی تصویر دیکھی تو نہ جانے کیوں اس پر ان کی نظر جم کر رہ گئی۔ کافی دیر تک انہماک سے اس تصویر کو دیکھنے کے بعد انہوں نے نیچے اس شخص کا نام دیکھا۔ نام تھا ”کمال امروہی“

فلم اسٹوڈیوز میں لوگوں کی گفتگو کے دوران مینا کماری نے یہ نام کئی بار سنا تھا۔ لوگ ان کا تذکرہ احترام اور پسندیدگی سے کرتے تھے اور ان کی گفتگو سے یہ اندازہ بھی ہوتا تھا کہ کمال امروہی کوئی نوجوان فلم رائٹر اور ڈائریکٹر تھے جن کی ایک فلم ”محل“ نے حال ہی میں بڑی زبردست کامیابی حاصل کی تھی۔ مینا کماری نے یہ بھی سنا تھا کہ ان صاحب کو اس فلم کا اسکرپٹ لکھنے اور ہدایتکاری کے فرائض انجام دینے کا معاوضہ ایک لاکھ روپے دیا گیا تھا جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔

اس میں شک نہیں کہ 1950ء میں فلمی دنیا میں بطور رائٹر اور ڈائریکٹر کمال امروہی کی سب سے زیادہ مانگ تھی۔ ان کے بارے میں یہ بھی مشہور تھا کہ وہ خاصے نخروں کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اپنے کام میں کسی کو دخل اندازی کی اجازت بالکل نہیں دیتے۔ حالانکہ فلمی دنیا میں ہمیشہ سے رواج چلا آرہا ہے کہ فلم کا فنانسر یا پروڈیوسر خواہ جاہل آدمی ہو اور خواہ وہ کیسی ہی احمقانہ بات کرے لیکن اکثر ڈائریکٹر، رائٹر اور دیگر لوگ وہ بات ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کیونکہ فلم اس شخص کے پیسے سے بن رہی ہوتی ہے لیکن کمال امروہی نے اس روایت کو توڑ دیا تھا۔ وہ فلم کی کہانی اور ڈائریکشن کے سلسلے میں کسی غیر متعلقہ آدمی کا ایک لفظ سننا بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ جنہیں ان سے کام لینا منظور ہوتا تھا، وہ ان کے کام میں ٹانگ اڑانے سے مکمل پرہیز کرتے تھے۔ کمال امروہی کے کام کرنے کا یہ انداز عمر بھر برقرار رہا۔

اس پس منظر کو ذہن میں تازہ کرتے ہوئے مینا کماری نے دوبارہ توجہ سے کمال امروہی کی تصویر کو دیکھا۔ اس نوجوانی میں بھی مینا کماری اگر کسی مرد کی طرف متوجہ ہوتی تھیں تو اس کی وجاہت یا دولتمندی کی وجہ سے نہیں ہوتی تھیں۔ کسی کا پروڈیوسر یا نامور ڈائریکٹر ہونا بھی مینا کماری کے لئے کشش یا مرعوبیت کا باعث نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف شاعروں اور ادیبوں کی شخصیت میں دلچسپی لیتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ کمال امروہی بنیادی طور پر شاعر اور ادیب ہی تھے جنہوں نے فلمی دنیا میں آکر بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔ آج پہلی بار مینا کماری نے ان کی تصویر دیکھی تھی۔ شکل صورت کے وہ ویسے بھی برے نہیں تھے لیکن شعر و ادب میں مینا کماری کی دلچسپی کی وجہ سے وہ انہیں کچھ زیادہ ہی پرکشش دکھائی دیئے۔ جن حوالوں کے ساتھ، یا جس پس منظر میں مینا کماری اس تصویر کو دیکھ رہی تھیں، اس نے اس کے گرد کشش کا ایک نادیدہ ہالہ پیدا کر دیا تھا۔ مینا کماری کے ذہن میں اپنے آئیڈیل کا خاکہ واضح نہیں تھا لیکن ان کا دل کہتا تھا اور تمنا کرتا تھا کہ ان کا آئیڈیل شخص تخلیقی صلاحیتوں کا مالک ضرور ہو، وہ شاعر ہو، ادیب ہو۔ خوبصورت شعر کہہ سکتا ہو، خوبصورت شعر سمجھ سکتا ہو، خوبصورت نثر لکھ سکتا ہو، اس کی تحریر، اس کی تخلیق میں نزاکت خیالی ہو، دلکشی ہو، نغمگی ہو۔ بیشتر نوجوان لڑکیوں کی طرح مینا کماری کی نوجوانی بھی ایک رومان پرست اور جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والی لڑکی کی نوجوانی تھی۔

کمال امروہی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے، لحہ بہ لحہ ان کا یہ احساس پختہ ہوتا چلا گیا کہ یہی وہ شخص تھا جس کے دھندلے دھندلے سے خواب وہ ایک عرصے سے دیکھتی آرہی تھیں۔ انہیں اسی کی تلاش تھی۔ یہی ان کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ گو کہ ان کے لاشعور سے ابھرنے والی کوئی مدہم سی آواز انہیں خبردار کرنے کی کوشش بھی کر رہی تھی کہ وہ ایک انجانے، ان دیکھے انسان کی شخصیت کے سحر میں گرفتار نہ ہوں لیکن وہ اس آواز کو ان سنی کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کا دل اس تصویر کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ وہ بھول چکی تھیں کہ بارہ سال پہلے یہ شخص سہراب مودی کی ایک فلم ”جیلر“ میں ایک بچی کے کردار کے لئے انہیں دیکھنے ان کے گھر آیا تھا۔ اس وقت وہ داور کے علاقے میں ایک عمارت کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہتی تھیں اور چھ سال کی تھیں۔ کسی وجہ سے کمال امروہی نے انہیں منتخب نہیں کیا تھا اور پلٹ کر نہیں آئے تھے۔

اس روز مینا نے کمال امروہی کی تصویر دیکھی تو وہ ان کی آنکھوں اور دل میں بس کر رہ گئی۔ عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ محبت جب کسی دل پر حملہ آور ہوتی ہے تو ملاقات کا بھی کوئی نہ کوئی بہانہ بن ہی جاتا ہے۔ مینا کماری ایک فلم ”تماشا“ میں دیو آنند اور اشوک کمار کے ساتھ کام کر رہی تھیں کہ کمال امروہی اس کے سیٹ پر چلے آئے۔ ان کے سیکرٹری باقر، جو ان کے دوست بھی تھے، ان کے ساتھ تھے۔ اشوک کمار نے سب لوگوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرایا۔ انہوں نے مینا کا تعارف بھی کمال امروہی سے کرایا۔ لیکن کمال امروہی نے محض اچٹتی سی نظر سے ان کی طرف دیکھا اور سر کو معمولی سی جنبش دے کر کسی اور سے بات کرنے میں مصروف ہو گئے۔

”بڑے مغرور آدمی ہیں!“ مینا نے دل ہی دل میں سوچا۔

اشوک کمار کو بھی ان کی اس بے توجہی پر شاید کچھ مایوسی ہوئی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے تجویز پیش کی کہ اوپر کی منزل پر، اسٹوڈیو کے پروجیکشن روم میں کمال امروہی کو فلم ”تماشا“ کے کچھ حصے دکھائے جائیں جو اب تک شوٹ اور ایڈٹ ہو چکے تھے۔ شاید وہ انہیں مینا کا اب تک کا کام دکھا کر بتانا چاہتے تھے کہ وہ لڑکی کتنی باصلاحیت ہے۔ کمال امروہی وہ پرنٹ دیکھنے کے لئے سب لوگوں کے ساتھ پروجیکشن روم میں چلے تو گئے لیکن تمام پرنٹس دیکھنے کے دوران بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ انہوں نے کسی کی اداکاری یا فلم کی کسی دوسری ممکنہ خامی یا خوبی کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن جب وہ اسٹوڈیو سے واپس روانہ ہوئے تو راستے میں، گاڑی میں انہوں نے اپنے سیکرٹری اور دوست، باقر سے کہا ”ہمیں اس لڑکی کو نظر میں رکھنا چاہئے۔“

”اس لڑکی“ سے ان کی مراد مینا تھی!

ان دنوں کمال امروہی اپنی آنے والی فلم ”انار کلی“ کی کاسٹنگ میں مصروف تھے۔ ”مکھن لال جی“ نامی ایک صاحب اس فلم کے پروڈیوسر تھے۔ کمال امروہی اور پروڈیوسر، دونوں اس بات پر متفق ہو چکے تھے کہ وہ مدھوبالا کو ہیروئن اور کمل کپور کو ہیرو لیں گے۔ مدھوبالا اس فلم میں کام کرنے کے لئے ہامی بھر چکی تھیں۔

ایک ہفتے بعد، جبکہ بیشتر انتظامات مکمل تھے اور کمال امروہی شوٹنگ شروع کرنے کی تیاری کر رہے تھے، ایک رات وہ کھانا کھانے بیٹھے تو فون کی گھنٹی بجی۔ کمال نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے مکھن لال جی بولے ”میرے پاس تمہارے لئے ایک بری خبر ہے۔“

”کیا مدھوبالا نے فلم میں کام کرنے سے انکار کر دیا ہے؟“ کمال نے ہموار لہجے میں پوچھا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“ مکھن لال جی نے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے پتا تو نہیں چلا لیکن آج کل میرے لئے سب سے بری خبر یہی ہو سکتی ہے۔“ کمال نے جواب دیا۔ پھر انہوں نے کچھ سوچ کر کہا ”بہر حال، تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میری نظر میں ایک لڑکی ہے جو مدھوبالا کی ہم پلہ ثابت ہو سکتی ہے۔ کل صبح دس بجے وہ میرے گھر پہ ہو گی۔“

سننے میں آیا ہے کہ مدھوبالا کے انکار کرنے کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ چاہتی تھیں، ان کے مقابل کمل کپور کے بجائے دلیپ کمار کو ہیرو لیا جائے جن سے ان کے عشق کے چرچے ان دنوں فلمی دنیا میں چل رہے تھے۔ تاہم یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ مدھوبالا کے انکار کی بڑی وجہ ان کے والد عطاء اللہ خان تھے۔ وہ چاہتے ہی نہیں تھے کہ مدھوبالا، کمال امروہی کی فلم میں کام کریں۔ وہ کمال امروہی کو کوئی اچھا فلم میکر نہیں سمجھتے تھے۔

کمال امروہی نے اسی رات باقر کو ماسٹر علی بخش کے گھر بات چیت کے لئے بھیج دیا کہ کیا ان کی بیٹی ”انار کلی“ کی ہیروئن بننے کے لئے تیار ہو گی اور ڈیٹس دے سکے گی؟ یہ پیغام سن کر علی بخش کی تو باچھیں کھل گئیں۔ وہ فلم انڈسٹری میں کمال امروہی کے نام اور مقام سے واقف تھے۔ ان کے نزدیک یہ ایک اعزاز تھا کہ کمال امروہی نے ان کی بیٹی کو اپنی فلم کی ہیروئن کے رول کی آفر کی تھی۔ انہوں نے بیٹی سے پوچھے بغیر ہی دل و جان سے ہامی بھر لی۔ اس وقت آسمانی رنگ کی قمیض اور غرارے میں ملبوس مینا بھی کمرے میں موجود تھیں اور کمال امروہی کا پیغام سن کر ان کے رخساروں پر گلاب کھل اٹھے تھے۔

(جاری ہے)

itsurdu.blogspot.com
اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
قسمت
نے اُن کے ساتھ ایک
بھیانک مذاق کیا تھا

قسمت نے ان کے ساتھ ایک بھیانک مذاق کیا تھا

قسط:6

باقر نے کہا کہ وہ دوسرے روز، صبح آکر گاڑی میں باپ بیٹی کو مکھن لال کے دفتر لے جائے گا جہاں تمام معاملات طے کئے جائیں گے اور باقاعدہ کنٹریکٹ سائن کیا جائے گا۔ ماسٹر علی بخش نے عاجزی سے کہا "آپ کو زحمت کی ضرورت نہیں۔ آپ کی دعا سے ہمارے پاس بھی گاڑی موجود ہے اور مینا ماشاءاللہ بہت اچھی ڈرائیونگ کر لیتی ہے۔ ہم خود مکھن لال جی کے دفتر پہنچ جائیں گے۔"

دوسرے روز دس گیارہ بجے کے قریب کمال امروہی، مینا اور علی بخش تینوں مکھن لال جی کے دفتر میں موجود تھے۔ مکھن لال، مینا سے مل کر متاثر نہیں ہوئے۔ انہیں لگا کہ یہ نئی اور نوآموز لڑکی شاید انار کلی کا رول خاطر خواہ طریقے سے ادا نہ کر سکے۔ انہوں نے مینا کے لئے صرف تین ہزار روپے معاوضے کی پیشکش کی۔ ماسٹر علی بخش کی امیدوں پر پانی پھر گیا اور وہ کچھ شرمسار سے بھی ہوئے کہ ان کی بیٹی کو ہیروئن کے کردار کے لئے صرف تین ہزار روپے کی پیشکش کی جا رہی تھی۔ انہوں نے کمال امروہی کو ایک طرف علیحدگی میں لے جا کر اس بات کا شکوہ بھی کیا۔ کمال امروہی کی مداخلت اور کافی دیر کی سودے بازی کے بعد آخر کار پندرہ ہزار پر معاملہ طے پا گیا۔ اس دوران مینا اس سودے بازی کو اتنا طول کھنچتے دیکھ کر کچھ خفا سی ہو کر، دفتر سے نکل کر، باہر اپنی گاڑی کے پاس جا کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے معاوضے کے سلسلے میں اتنی زیادہ سودے بازی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی وہ اس موضوع پر ہونے والی گفتگو میں کبھی حصہ لیتی تھیں۔

آخر کار معاوضے کا معاملہ طے پا جانے کے بعد 13، مارچ 1951ء کو مینا کماری نے فلم "انار کلی" کے لیے کنٹریکٹ سائن کر دیا اور کمال امروہی قدرے سکون کی سانس لے کر لوکیشنز دیکھنے کے لیے آگرہ اور دہلی کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ ابھی فلم کی شوٹنگ شروع ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ مینا کماری پر ٹائیفائڈ کا حملہ ہو گیا۔ ویسے بھی وہ بچپن ہی سے کوئی خاص صحت مند نہیں تھیں۔ بخار نے انہیں بہت کمزور کر دیا اور ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ آب و ہوا کی تبدیلی ان کے لیے بہتر رہے گی۔ چنانچہ ان کے والد اور بہنوں نے فیصلہ کیا کہ دو ہفتے مہابلیشور میں گزارے جائیں۔ یہ ممبئی سے تقریباً 200، میل دور ایک پہاڑی مقام تھا اور صحت افزا سمجھا جاتا تھا۔

اس دوران کمال امروہی آگرہ اور دہلی میں مصروف رہے۔ 21، مئی کو وہ دہلی کے سیسل ہوٹل میں اپنے فلمی یونٹ کے چند افراد کے ہمراہ مقیم تھے کہ کسی نے آکر انہیں خبر دی کہ مینا کماری نام کی ایک نوجوان اداکارہ مہابلیشور سے ممبئی واپس آ رہی تھی کہ اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا جس میں وہ زخمی ہو گئی۔ کمال امروہی کو حادثے کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں۔ حقیقت یہ تھی کہ مینا کماری اس حادثے میں شدید زخمی ہوئی تھیں۔ وہ پونا کے ایک اسپتال میں داخل تھیں اور ان کے ایک ہاتھ کے بارے میں ڈاکٹروں کو اندیشہ تھا کہ وہ عمر بھر کے لیے ناکارہ نہ ہو گیا ہو۔

ان کے والد علی بخش کی بھی تین ہڈیاں ٹوٹی تھیں جن پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ صرف مدھو کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔ مینا کماری کی حالت تو خطرے سے باہر تھی لیکن یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب تک چلنے پھرنے کے قابل ہو سکیں گی۔ وہ اسپتال میں بیڈ پر لیٹی تھیں اور سخت ڈپریشن کا شکار تھیں۔ انہیں یوں لگ رہا تھا کہ قسمت نے ان کے ساتھ ایک بھیانک مذاق کیا تھا۔ عین اس وقت، جب ان کا کیریئر بلندیوں کی طرف جانے لگا تھا، قسمت نے انہیں بستر پر لٹا دیا تھا۔ انہیں صدمہ صرف اس بات کا نہیں تھا کہ ان کا کیریئر خطرے میں پڑ گیا تھا، اس سے زیادہ صدمہ انہیں اس بات کا تھا کہ دل ہی دل میں وہ جس شخص کو گویا پوجتی تھیں، اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع انہیں اپنے ہاتھ سے جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

24، مئی 1951ء کی شام وہ اپنے بیڈ پر لیٹی اسی قسم کی سوچوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ ان کا دل کچھ زیادہ ہی افسردہ اور پریشان تھا۔ ڈپریشن بڑھا ہوا تھا۔ اچانک انہیں یوں لگا جیسے کوئی ان کے بیڈ کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ان کے قریب کمال امروہی کھڑے تھے۔

"کیسی ہیں آپ؟" کمال امروہی نے نہایت نرم آواز میں، بے حد شائستگی سے پوچھا۔

مینا کماری کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اور جب یقین آیا تو حیرت اور خوشی کے باعث وہ کوئی جواب نہ دے سکیں۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کمال امروہی ان کی مزاج پرسی کے لیے آئیں گے۔ اس وقت سورج ڈوب رہا تھا اور کمرے کی کھڑکی کے راستے اس کی الوداعی کرنیں کمرے کے ملگجے سے اندھیرے میں نارنجی روشنی بکھیرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ گو کہ یہ کوئی اچھا موقع نہیں تھا۔ زخمی مینا کماری اسپتال کے بیڈ پر پڑی تھیں۔ اس کے باوجود کمال امروہی کے شاعرانہ مزاج نے اس میں خوبصورتی کا پہلو ڈھونڈ لیا۔

وہ قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔ مینا کی چھوٹی بہن نے ان سے شکایت کی کہ ڈاکٹر نے مینا کو موسمی کا جوس پینے کی ہدایت کی ہے لیکن وہ پیتی نہیں ہیں۔ کمال بولے "لاؤ... جوس مجھے لا کر دو، میں پلاتا ہوں، دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں پیتیں۔" مینا کی بہن نے جوس کا گلاس کمال کو دے دیا۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے مینا کا سر اونچا کیا اور دوسرے ہاتھ سے جوس کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مینا کے لیے یہ گویا خواب کا سا منظر تھا۔ وہ خیالوں ہی خیالوں میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ کیا واقعی ان کا سر کمال امروہی کے بازو پر تھا؟ کیا واقعی وہ اسے اپنے ہاتھ سے جوس پلا رہے تھے؟ انہیں اس منظر پر یقین نہیں آ رہا تھا اور وہ اپنی ساری تکلیفیں بھول کر محبت کے اس طلسم کدے میں نہ جانے کہاں سے کہاں اڑتی پھر رہی تھیں۔ انہوں نے موسمی کے جوس کا پہلا گھونٹ کیا بھرا، گویا محبت کے راستے پر پہلا قدم بھی رکھ دیا۔ یہ ایک نہایت ہی افسانوی سی محبت کا شاعرانہ آغاز تھا۔

مینا ایک سانس میں سارا جوس پی گئیں۔ یہ جوس نہیں، گویا کوئی ایسا مشروب تھا جس میں محبت کا نشہ تھا اور وہ نشہ مینا کی نس نس میں اتر گیا۔ یہ محبت یک طرفہ نہیں تھی۔ اسی لمحے محبت کے دیوتا نے ایک ہی تیر سے مینا کے ساتھ ساتھ کمال کو بھی شکار کیا۔ وہ بھی اسی لمحے مینا کے سامنے دل ہار گئے۔

اس دن کے بعد سے کمال امروہی کا معمول بن گیا کہ وہ ہفتے میں ایک بار ممبئی سے پونا آتے، نہایت محبت اور اپنائیت سے مینا کے پاس بیٹھ کر اس کی تیمارداری اور دلداری کرتے۔ گھنٹوں گزر جاتے اور دونوں کو یوں لگتا جیسے چند لمحے گزرے ہیں۔ اس سے پہلے مینا کے لیے کمال امروہی صرف ایک قابل ڈائریکٹر تھے اور کمال کے لیے مینا محض ایک اداکارہ، ایک فنکارہ تھیں جس کے بارے میں انہیں محسوس ہوا تھا کہ اس کے اندر بے پناہ فنکارانہ صلاحیتیں چھپی ہوئی تھیں لیکن قربتوں کے ان دنوں میں انہوں نے صحیح معنوں میں ایک دوسرے کو دریافت کیا، اپنے اپنے دل میں ایک دوسرے کے لیے چھپی ہوئی محبت کو دریافت کیا۔ انہیں لگا کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔

ہفتے میں ایک بار ملاقات ان کے لیے کافی نہیں تھی لیکن ہفتے میں ایک سے زیادہ مرتبہ ممبئی سے پونا آنا کمال کے لیے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس کا حل ان دونوں نے یہ نکالا کہ ملاقات کے بعد ان کے جتنے دن جدائی میں گزرتے، اس دوران وہ ایک دوسرے کے نام خط لکھتے رہتے لیکن ان خطوں کو پوسٹ کرنے کے بجائے وہ اپنے پاس جمع کرتے رہتے۔ جس روز ان کی ملاقات ہوتی، اس روز سب سے پہلے وہ خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف کاغذ کا ایک پیکٹ بڑھا دیتے۔ کمال امروہی کے پیکٹ میں ان کے خطوط ہوتے تھے جو انہوں نے مینا کے نام لکھے ہوتے تھے اور مینا کے پیکٹ میں ان کے خطوط کمال کے نام ہوتے تھے۔ یوں ہفتے بھر تک ہجر کی آگ میں جلنے والے دونوں پریمیوں کے ایک ایک پل کا احوال ایک دوسرے تک پہنچ جاتا۔

دونوں کو ایک دوسرے کا یہ احوال جاننے کی اس قدر بے تابی ہوتی کہ کمال امروہی خطوط کا پیکٹ لے کر مینا کے کمرے کی بالکونی میں چلے جاتے اور وہاں کھڑے ہو کر ترتیب سے ایک ایک خط کھول کر پڑھنا شروع کر دیتے اور مینا اپنے بیڈ پر ہی تکیے کے سہارے بیٹھ کر خطوط کے مطالعے میں مصروف ہو جاتیں۔ ایک دوسرے کے تمام خطوط پڑھ کر دونوں کے بے قرار دل کو گویا کچھ قرار آ جاتا۔ اس دوران دونوں نے ایک دوسرے کے 'محبت کے نام' بھی رکھے۔ دونوں کے خیال میں ایک دوسرے کے نام نہایت رسمی اور عام سے تھے۔ ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ محبت سے ایک دوسرے کو کچھ اور کہہ کر پکاریں۔ مینا کو "چندن" نام بہت اچھا لگتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے کمال کو تنہائی میں پیار سے مخاطب کرنے کے لیے ان کا نام چندن رکھ دیا جبکہ کمال امروہی نے انہیں منجو کہنا شروع کر دیا۔ منجو عام طور پر منجھلی بیٹی کو بھی کہا جاتا ہے۔ مینا واقعی اپنے والدین کی منجھلی بیٹی تھیں۔

ایک روز مینا کو خیال آیا کہ انہیں بستر پر پڑے کافی دن گزر گئے ہیں، نہ جانے اب وہ 'انار کلی" کی کاسٹ میں شامل بھی ہیں یا نہیں؟ انہوں نے یہ بات کمال امروہی سے پوچھ ہی لی۔ کمال امروہی نے جواب دیا "انار کلی فلم صرف اس صورت میں بنے گی جب تم اس کی ہیروئن ہو گی، ورنہ انار کلی بنے گی ہی نہیں۔"

اس یقین دہانی پر مینا محبت اور ممنونیت سے مسکرا دیں۔ کمال امروہی نے صرف اس یقین دہانی پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ مینا کا ہاتھ تھام کر اپنے قلم سے ان کی ہتھیلی پر لکھ دیا... "میری انار کلی"

اس وقت مینا کے تاثرات دیکھنے والا شاید یہی نتیجہ اخذ کرتا کہ ان دو لفظوں نے مینا کو زندگی کی سب سے بڑی خوشی بخش دی ہے۔ اس خوشی میں شرمیلے پن کی آمیزش نے ان کے تاثرات کو مزید دلکش بنا دیا تھا۔ انہوں نے وہ ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا جس پر کمال نے یہ دو لفظ لکھے تھے۔ آنکھیں بند کر کے وہ گویا ان دو الفاظ کے سہارے خوبصورت خوابوں کے کسی دیس کے سفر پر روانہ ہونا چاہ رہی تھیں۔

کسی ہفتے ایسا بھی ہوتا کہ کمال امروہی اپنی مصروفیات کی وجہ سے ممبئی سے پونا آنے سے قاصر رہتے۔ اس ہفتے انہیں ممبئی میں پونا کے اسپتال سے فون آتا کہ مینا نامی ایک مریضہ اپنی کوئی دوا نہیں کھا رہی ہے، اس کا اصرار ہے کہ کمال امروہی آکر اپنے ہاتھ سے اسے دوا کھلائیں گے تو وہ کھائے گی، ورنہ نہیں کھائے گی۔ تب کمال امروہی فون پر بڑے پیار سے، لیکن بڑی مشکل سے مینا کو سمجھانے میں کامیاب ہوتے کہ وہ ان کی مجبوریوں کا احساس کرے، اگر وہ آنے کی پوزیشن میں ہوتے تو ضرور آ جاتے، ان سے خود بھی مینا کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ بہت سمجھانے بجھانے پر آخر کار مینا اپنی دوا کھاتیں۔

اسپتال میں پروان چڑھنے والا یہ عشق، اسپتال میں ہی چار ماہ جاری رہا۔ آخر کار ڈاکٹروں نے مینا کو مکمل صحت مند اور گھر جانے کے قابل قرار دے دیا۔ صرف ان کا ایک ہاتھ تھوڑا سا ٹیڑھا اور کسی حد تک ناکارہ ہو گیا تھا۔ ان کی باقی زندگی میں بھی وہ ہاتھ ویسا ہی رہا۔ مینا کو صحت یاب ہو کر اسپتال سے جانا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا کیونکہ اسپتال وہ جگہ تھی جہاں انہیں اپنی زندگی کی وہ پہلی محبت ملی تھی جس کے خواب ہر انسان دیکھتا ہے۔

مینا کماری کے ممبئی واپس پہنچتے ہی "انار کلی" کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ ابتداء میں انار کلی کو زنداں میں ڈالے جانے کے چند مناظر شوٹ کئے گئے۔ جن لوگوں نے ان مناظر کے پرنٹ دیکھے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ان میں مینا کماری کی اداکاری کا جو معیار نظر آیا تھا، اس کی مناسبت سے یہ پرنٹ اداکاری کی کسی اعلیٰ درجے کی اکیڈمی میں طلباء کو دکھانے کے لیے رکھے جا سکتے تھے، وہ انہیں دیکھ کر بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ مینا کماری نے ثابت کر دیا تھا کہ کمال امروہی نے اگر اداکارانہ صلاحیتوں کے سلسلے میں ان سے کچھ توقعات وابستہ کی تھیں تو غلط نہیں کیا تھا۔ مینا کماری نے اپنی پرفارمنس سے ان کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ (جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
فلم اِنڈسٹری میں ان کے
عشق کے چرچے ہونے لگے

فلم انڈسٹری میں ان کے عشق کے چرچے ہونے لگے

قسط:7

دوسری طرف ان کے عشق کی جڑیں گہری ہو رہی تھیں۔ کمال امروہی روزانہ رات کو ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے مینا کماری کو فون کرتے اور صبح ساڑھے پانچ بجے ریسیور رکھتے۔ چھ گھنٹے کی اس گفتگو میں زیادہ تر وقفے اور آہیں یا ٹھنڈی سانسیں ہوتیں، الفاظ کم ہی استعمال ہوتے۔ مینا کماری ریسیور کان سے لگا کر نہیں، بلکہ دل سے لگا کر کمال امروہی کی آواز سنتیں۔ کمال رات کو تاخیر سے فون اس لیے کرتے تھے کہ بیٹیوں پر کڑی نگرانی رکھنے والے علی بخش اس وقت سو چکے ہوتے تھے اور مینا، فون کی پہلی گھنٹی شروع ہوتے ہی ریسیور اٹھا لیتی تھیں۔ فون ان کے بیڈ روم کے دروازے کے قریب ہی رکھا ہوتا تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے بیڈ روم میں لے جاتیں اور فون سمیت چادر، کمبل یا لحاف میں چھپ جاتیں۔ راتوں کو ٹیلیفونک گفتگو کا یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔ اس کی وجہ سے ہی دونوں آئندہ زندگی میں بے خوابی کے مریض بن گئے۔

"انارکلی" کی شوٹنگ زیادہ عرصے جاری نہ رہ سکی۔ اس کے پروڈیوسر مکھن لال جی اسٹاک مارکیٹ میں سرمایہ لگانے کے بھی زبردست رسیا تھے۔ شیئرز خریدنے کا انہیں گویا نشہ تھا۔ وہ اسٹاک مارکیٹ میں کچھ ایسی بازی کھیل بیٹھے کہ ان پر وہ محاورہ صادق آنے لگا کہ ان کے تن کے کپڑے تک بک گئے۔ گو کہ انہوں نے بلند ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، کسی نہ کسی طرح فلم کے لیے تھوڑا بہت سرمایہ فراہم کرنے کا وعدہ کیا لیکن کمال امروہی یہ تاریخی فلم شایان شان طریقے سے بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اسے جیسے تیسے مکمل کرنے کے بجائے اس کا منصوبہ ملتوی کر دینے کو ترجیح دی۔ مینا کماری نے یہ خبر سن کر کسی خاص تاسف کا اظہار نہیں کیا۔ ویسے بھی انہیں فلم کے بننے یا نہ بننے سے اتنی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی تمام تر دلچسپی کا محور و مرکز تو صرف کمال امروہی تھے۔

مینا کماری نے فلم "انارکلی" کا منصوبہ ملتوی ہونے کا کوئی اثر بھی نہیں لیا اور ان کے لیے اس سے کوئی خاص فرق بھی نہیں پڑا کیونکہ انہی دنوں انہیں دو ایسی فلموں کی آفرز آ گئیں جو ان کے کیریئر میں اہم سنگ میل ثابت ہوئیں۔ ان دو فلموں نے ہی در حقیقت انہیں انڈین فلم انڈسٹری میں ایک "بڑی اداکارہ" کا درجہ دلوایا۔ ان میں سے ایک، ضیاء سرحدی کی "فٹ پاتھ" تھی اور دوسری وجے بھٹ کی "بیجو باورا۔"

مینا کماری نے ان دونوں فلموں کے اسکرپٹ پڑھے۔ وہ ان میں کام کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئیں لیکن مزید ماہرانہ اور پیشہ ورانہ رہنمائی کے لیے انہوں نے یہ اسکرپٹ کمال امروہی کو بھجوا دیئے۔ کمال امروہی کو ضیاء سرحدی کی "فٹ پاتھ" کا اسکرپٹ زیادہ پسند آیا۔ تاہم انہوں نے مینا کو دونوں ہی فلموں کی پیشکش قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ ایک بہت ہی اہم اور یادگار مشورہ تھا کیونکہ اگر مینا کماری نے "بیجو باورا" چھوڑ دی ہوتی تو انڈیا کی فلمی تاریخ میں ان کا مقام نہ جانے کتنا مختلف ہوتا۔

کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتا۔ خاص طور پر، مشہور لوگوں کے لیے تو اپنے عشق کو راز رکھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ 1951ء کے اواخر تک فلم انڈسٹری میں مینا کماری اور کمال امروہی کے عشق کے خوب چرچے ہونے لگے تھے۔ لوگوں کو یہ بھی اندازہ تھا کہ عشق کرنے والے اس جوڑے کے راستے میں کتنی مشکلات حائل تھیں۔ سبھی ان دونوں کے بارے میں حیرت سے سوچتے تھے اور اندازے لگانے کی کوشش کرتے تھے کہ عشق کی یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی؟ کمال امروہی نہ صرف مینا کماری سے پندرہ سال بڑے تھے بلکہ پہلے سے شادی شدہ اور تین عدد بچوں کے باپ بھی تھے۔ گو کہ مسلمان ہونے کے ناتے ان کے پاس چار شادیاں کرنے کی گنجائش تھی لیکن مینا کماری کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کمال امروہی کی پہلی بیگم کی سوتن اور ان کے بچوں کی چھوٹی امی کہلانا گوارا کر لیں گی یا نہیں؟

حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں افراد جو ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار تھے، انہوں نے ابھی تک اس موضوع پر بات ہی نہیں کی تھی کہ ان کے عشق کا انجام کیا ہوگا، شادی کے مسئلے کو دونوں میں سے کسی نے کبھی نہیں چھیڑا تھا۔ ان دونوں کے ذہنوں میں شاید کہیں یہ سوال موجود ہو لیکن وہ اسے زبان پر نہیں لائے تھے جبکہ ان کے عشق کے بارے میں جاننے والے لوگ تجسس کے مارے گویا سانسیں روکے انتظار کر رہے تھے کہ دیکھیں، اس عشق کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اُدھر عشق کے مارے دونوں فریق دن رات دُہری مشقت سے گزر رہے تھے۔ کم از کم مینا کماری کی مصروفیت تو بلاشبہ اعصاب شکن تھی۔ ان کی فلم "تماشا" اختتامی مراحل میں تھی جبکہ "فٹ پاتھ" اور "بیجو باورا" کی شوٹنگ شروع ہونے کے دن سر پر آ رہے تھے۔ مینا کماری کا دن فلمی مصروفیات میں گزرتا اور رات کمال امروہی سے فون پر عشقیہ گفتگو میں جاگ کر گزرتی۔

کمال امروہی اور مینا کماری کے عشق کے چرچے جس شخصیت کے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ تھے، وہ مدھو بالا تھیں۔ جن دنوں کمال نے فلم "محل" ڈائریکٹ کی تھی، ان دنوں مدھو بالا نوجوان تھیں اور شاید اسی عمر سے انہوں نے کمال کو دل میں بسا لیا تھا۔ یہ ان کا نوخیزی کی عمر کا خاموش عشق تھا لیکن اتنا زیادہ خاموش بھی نہیں تھا۔ "بمبئی ٹاکیز" اسٹوڈیو میں مدھو بالا کو دیواروں پر جہاں جگہ خالی نظر آتی، وہاں وہ چاک سے کمال امروہی کا نام لکھ دیا کرتی تھیں۔ یہ لڑکپن کے معصوم سے عشق کے اظہار کا ایک انداز تھا۔

اس میں شک نہیں کہ شکل صورت اور جسمانی خدوخال کے اعتبار سے مدھو بالا ایک نہایت پُرکشش شخصیت کی مالک تھیں لیکن شعری و ادبی ذوق، تخلیقی صلاحیتوں کی قدردانی یا سوچ اور پرواز تخیل کے معاملے میں ان کا مینا کماری سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ شاید اسی لیے کمال امروہی نے ان کی نظروں میں چھپے محبت کے پیغام کو محسوس نہیں کیا تھا اور اگر محسوس کیا تھا تو اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ اس قسم کے آدمی نہیں تھے کہ محض جسمانی کشش کی وجہ سے کسی خاتون کے عشق میں گرفتار ہو جاتے۔

اُدھر مدھو بالا کے عشق نے کچھ ایسی شدت اختیار کی کہ ایک روز انہوں نے کمال امروہی کے ایک دوست کو اسٹوڈیو میں آتے دیکھ کر راستے میں روکا اور بلا تمہید اس سے پوچھ لیا۔ "یہ جو میں کمال صاحب اور مینا کے عشق کے قصے سن رہی ہوں، کیا یہ سچ ہیں؟"

اس دوست نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اثبات میں جواب دے دیا۔

سننے میں آیا ہے کہ اس کے تین دن بعد مدھو بالا رات کو اپنی گاڑی میں اسٹوڈیو پہنچیں تو انہیں سامنے سے کمال امروہی اپنے دوستوں کے ساتھ آتے نظر آ گئے۔ وہ گاڑی پارک کر کے ان کے پاس پہنچیں اور براہ راست کمال سے مخاطب ہوئیں۔ "آپ ذرا علیحدگی میں میری بات سن سکتے ہیں؟ میں آپ کا دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں لوں گی۔"

کمال اپنے دوستوں سے معذرت کر کے مدھو بالا کے ساتھ ایک گوشہ تنہائی میں چلے گئے۔ مدھو بالا نے ان کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع نہیں کیا اور بولیں۔ "کمال صاحب! میں چاہتی ہوں، آپ میرا ہاتھ تھام لیں... مجھ سے شادی کر لیں۔ میں آپ کو فلم پروڈکشن شروع کرنے کے لیے تین لاکھ روپے دے سکتی ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنی پہلی بیوی کو بھی ساتھ رکھیں۔ صرف اپنے بچوں کو امروہہ بھیج دیں۔" (امروہہ، یوپی میں کمال امروہی کا آبائی گاؤں تھا)

کمال امروہی نے ایک لمحے کے لیے بھی اس پیشکش پر غور نہیں کیا اور ناگواری سے جواب دیا۔ "میں صرف اپنی کہانیاں بیچتا ہوں۔ اپنی محبت اور اپنے بچے نہیں۔"

ظاہر ہے، مدھو بالا یہ جواب سن کر مایوس اور دل شکستہ ہوئیں۔

دوسری طرف مینا کماری کو بھی احساس تھا کہ لوگ ان کے اور کمال امروہی کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے ہیں، وہ اس سوال پر بھی غور کرتی تھیں کہ آخر ان کے عشق کا انجام کیا ہوگا؟ لیکن ظاہر ہے، ان کی نسوانی انا انہیں خود کمال امروہی سے شادی کے موضوع پر بات شروع کرنے سے باز رکھتی تھی۔ انہیں امید تھی کہ جب بھی حالات اجازت دیں گے، کمال امروہی خود ان سے شادی کے بارے میں بات کریں گے۔

ان کی یہ توقع پوری نہیں ہو سکی۔ کمال امروہی نے خود تو ان سے شادی کے موضوع پر بات نہیں کی لیکن ایک روز کمال کے دوست اور رازدار باقر، جو ان کے سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیتے تھے، مینا کے پاس آئے اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد بولے۔ "کیا آپ کمال صاحب سے محبت کرتی ہیں؟"

"بہت زیادہ۔" مینا نے بلا تامل جواب دیا۔

"تو پھر ان سے شادی کر لیجئے اور یہ پوری پوری رات ٹیلیفون پر باتیں کرنے کا بچگانہ معمول ترک کر دیجئے۔" باقر نے گہری سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"لیکن بابو جی کی اجازت کے بغیر میں کیسے شادی کر سکتی ہوں؟" مینا نے بے چارگی سے کہا۔ "بابو جی اس شادی کی اجازت کبھی نہیں دیں گے۔"

"بابو جی" سے مینا کی مراد ان کے والد علی بخش تھے۔ اس میں شک نہیں کہ علی بخش کی مرضی کے بغیر شادی کرنے کی مینا کماری میں ہمت نہیں تھی لیکن جب تینوں فریقوں یعنی کمال، مینا اور باقر کے درمیان اس موضوع پر صلاح مشورے شروع ہوئے تو پھر وقتی طور پر اس رکاوٹ کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور دو پیار بھرے دلوں کے، کم از کم قانونی ملاپ کے لیے ایک منصوبہ تیار کر لیا گیا۔

14، فروری 1952ء کی رات علی بخش اپنی دونوں بیٹیوں مینا اور مدھو کو گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر جسوال کے کلینک کی طرف روانہ ہوئے۔ مینا کماری کے ایکسیڈنٹ کے بعد سے ان کے ہاتھ میں جو نقص رہ گیا تھا، اسے دور کرنے کے لیے انہیں فزیو تھراپی کا مشورہ دیا گیا تھا۔ فزیو تھراپی کے لیے علی بخش ایک مخصوص وقت پر مینا اور اس کی چھوٹی بہن مدھو کو گاڑی میں بٹھا کر ڈاکٹر جسوال کے کلینک لے جاتے تھے جو ان کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مینا کو ڈاکٹر کے ہاں تقریباً دو گھنٹے لگتے تھے۔ علی بخش دونوں بہنوں کو کلینک کے سامنے اتار کر گھر چلے جاتے تھے اور دو گھنٹے بعد انہیں لینے کے لیے دوبارہ آ جاتے تھے۔ کلینک ایک عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔

اس روز جب علی بخش دونوں بیٹیوں کو عمارت کے سامنے اتار کر گاڑی گھما کر واپس روانہ ہوئے تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج ان کی پیٹھ پیچھے کیا ہونے والا ہے۔ دونوں بیٹیاں انہیں دکھانے کے لیے بظاہر کلینک کی سیڑھیاں چڑھنے لگی تھیں لیکن وہ کلینک تک نہیں پہنچیں۔ وہ چند سیڑھیاں چڑھ کر رک گئیں اور جب گاڑی ایک موڑ مڑ کر غائب ہو چکی تو دونوں بہنیں سیڑھیاں اتر کر واپس سڑک پر آ گئیں۔ مدھو آج کے منصوبے میں شریک تھی۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک دوسری عمارت کی آڑ میں ایک بیوک کھڑی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر باقر موجود تھا۔ مینا اور مدھو جا کر اس بیوک میں بیٹھ گئیں۔ گاڑی تیز رفتاری سے ایک طرف روانہ ہو گئی۔ (جاری ہے)

itsurdu.blogspot.com
MEENA
KUMARI
اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
خفیہ شادی
کا راز کھلا تو گھر میں
بھونچال آگیا
itsurdu.blogspot.com

اداکارہ مینا کماری کی داستان حیات

قسط:8

چند منٹ بعد گاڑی باقر کے مکان کے سامنے رکی جہاں کمال امروہی موجود تھے۔ وہ اکیلے ہی وہاں نہیں تھے۔ ان کے ساتھ ایک نکاح خواں مولوی صاحب اپنے دو صاحبزادوں سمیت موجود تھے۔ مولوی صاحب نے مینا کماری کا نکاح کمال امروہی کے ساتھ پہلے سنّی فقہ کے مطابق پڑھایا، پھر اہل تشیع کے فقہ کے مطابق پڑھایا۔ مولوی صاحب کے دونوں صاحبزادے اور باقر وغیرہ گواہ بنے۔ اس ساری کارروائی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ نکاح تو ہو گیا لیکن آتش عشق میں سلگتے ہوئے دو دلوں کے لیے یہ وصل کی رات یا شب عروسی نہیں تھی۔ مینا کماری اور کمال امروہی، دونوں کو الگ الگ، اپنے اپنے گھر واپس جانا تھا۔ کمال نے مینا کو پیشانی پر بوسہ دے کر رخصت کر دیا۔

دونوں بہنیں بیوک میں بیٹھ کر ڈاکٹر جسوال کے کلینک لوٹ آئیں۔ وہ اب بھی کلینک کے اندر نہیں گئیں۔ سیڑھیوں ہی میں رک گئیں۔ جب انہوں نے نیچے اپنی گاڑی کو رکتے دیکھا تو یوں سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گئیں جیسے ابھی کلینک سے نکلی ہیں۔ علی بخش جب حسب معمول دونوں بیٹیوں کو گاڑی میں بٹھا کر واپس روانہ ہوئے، اس وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی مینا اب محض ان کی بیٹی نہیں رہی بلکہ ”سیّد امیر حیدر کمال امروہی“ کی ”زوجہ“ بھی بن چکی ہے۔ نکاح نامے میں کمال امروہی کا پورا نام یہی لکھا گیا تھا۔ مینا کماری کا بھی اصل نام، یعنی ماہ جبیں لکھا گیا تھا۔ مینا کماری اور کمال امروہی نے یہ شادی جذبات کے ریلے میں بہہ کر نہیں کی تھی اور نہ ہی مستقبل کی طرف سے آنکھیں بند کر کے لمحۂ موجود میں صرف اپنے دل کو تسلی دی تھی۔ انہوں نے یہ سوچا تھا کہ سردست اس شادی کو راز رکھا جائے گا۔ دونوں کو ہی معلوم تھا کہ علی بخش کے لیے مینا کماری سونے کے انڈے دینے والی مرغی تھی۔ اگر مینا انہیں چھوڑ کر جانے کی بات کرتی تو وہ واویلا کر سکتے تھے کہ وہ عمر رسیدہ ہیں، ان کا کوئی ذریعہ معاش نہیں، اگر پیسہ کمانے والی بیٹی بھی انہیں چھوڑ گئی تو وہ اور ان کی چھوٹی بیٹی مدھو کیسے گزر اوقات کریں گے۔ لہٰذا مینا اور کمال نے یہی سوچا تھا کہ ان کا منہ بند کرنے اور آئندہ کے لیے سچ مچ ان کی گزر بسر کا کوئی بندوبست کرنے کے لیے انہیں کم از کم دو لاکھ روپیا دے دیا جائے گا تاکہ انہیں اور مدھو کو مالی پریشانی نہ ہو۔ مینا کی بڑی بہن خورشید اس وقت تک شادی کر کے اپنا گھر بسانے پاکستان جا چکی تھی۔ کمال امروہی نے پورے خلوص اور ہمدردی سے مینا کو یقین دلایا تھا کہ وہ پوری کوشش کریں گے کہ جلد از جلد مطلوبہ رقم جمع ہو جائے۔ تب تک وہ ہفتے میں صرف ایک بار، اتوار کو مینا سے ملنے آیا کریں گے لیکن انہوں نے مینا سے وعدہ لیا کہ اس دوران روزانہ رات کو فون پر گفتگو کا معمول جاری رہے گا۔

اپریل 1952ء میں مینا کماری کی فلم ”تماشا“ مکمل ہوتے ہی ”بیجو باورا“ کی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ ادھر ضیا سرحدی کی ”فٹ پاتھ“ کا کام بھی شروع ہونے والا تھا۔ اسی دوران ہدایتکار بمل رائے نے بھی مینا کماری سے رابطہ کیا۔ وہ بنگالی رائٹر سرت چندر چٹرجی کے ناول ”پرینیتا“ پر اُردو میں فلم بنانا چاہتے تھے اور مینا کماری کو مرکزی کردار میں کاسٹ کرنا چاہ رہے تھے۔ ادھر ”بمبئی ٹاکیز“ فلم اسٹوڈیو بھی اپنی ایک فلم ”کوہ نور“ میں مینا کماری کو ہیروئن لینے کے لیے رابطہ کر چکا تھا۔ یوں مینا کماری کی مصروفیت تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

اسی دوران ایک اہم واقعہ یہ ہوا کہ علی بخش کو اپنی بیٹی اور کمال امروہی کی شادی کا علم ہو گیا۔ یہ راز کیسے فاش ہوا، اس سلسلے میں مختلف باتیں سُننے میں آئیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ گھر کے خانساماں نے مینا کماری کو کمال امروہی سے فون پر بات کرتے سُن لیا تھا اور گفتگو سے اسے اندازہ ہوا کہ دونوں کی حیثیت اب میاں بیوی کی ہے۔ اس نے فوراً جا کر یہ اطلاع علی بخش کو دی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ نکاح پڑھوانے والے مولوی صاحب نے ہی مخبری کر دی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں مینا کماری کی چھوٹی بہن مدھو کی زبان پھسل گئی تھی اور اس کے منہ سے غیر ارادی طور پر یہ بات نکل گئی تھی۔

ذریعہ خواہ کچھ بھی رہا ہو، لیکن علی بخش بہر حال اس راز سے آگاہ ہو گئے۔ انہوں نے فوراً مینا کماری سے اس بات کی تصدیق چاہی۔ مینا کماری نے تسلیم کر لیا کہ انہوں نے جو سُنا ہے، وہ دُرست ہے۔ علی بخش کا غصے سے بُرا حال ہو گیا۔ انہوں نے نہ صرف اس بات پر برہمی کا اظہار کیا کہ مینا نے یہ کام خفیہ طور پر کیا تھا بلکہ اس وجہ سے بھی شدید ناراضگی ظاہر کی کہ یہ ایک قطعی بے جوڑ شادی تھی۔ انہوں نے مینا کو احساس دلانے کی کوشش کی کہ انہوں نے ایک ایسے شخص سے شادی کر کے کتنی بڑی حماقت کی تھی جو پہلے سے شادی شدہ اور تین بچوں کا باپ تھا۔ مینا اپنے اقدام کو اپنی حماقت تسلیم کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں تھیں۔ والد کے گرجنے برسنے سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تاہم انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ دروازہ انہوں نے اندر سے بند کر لیا۔

مینا کماری کی جب کمال امروہی سے آئندہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کمال کو بتا دیا کہ گھر پر ان کے والد نے کس طرح ان کی زندگی اجیرن کی ہوئی تھی اور اب وہ انہیں یہ بھی سمجھا رہے تھے کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا تھا، اب بھی وہ کمال سے طلاق لے سکتی تھیں۔ علی بخش خود جا کر اس سلسلے میں کمال امروہی سے بات کرنے پر تیار تھے۔ کمال نے مینا کو خاموش رہنے اور اپنے کام سے کام رکھنے کا مشورہ دیا۔ انہیں اُمید تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ علی بخش اس حقیقت سے سمجھوتا کر لیں گے جسے اب تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس ملاقات میں مینا کماری نے کمال امروہی کے سامنے اپنی مقدس ترین مذہبی کتاب پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ ان کی شرعی اور قانونی بیوی کی حیثیت سے وہ زندگی بھر خلوص اور وفاداری سے ان کا ساتھ نبھائیں گی اور اگر وہ انہیں ذبح بھی کریں گے تو وہ اُف تک نہیں کریں گی۔ کم از کم اس وقت کمال سے مینا کی محبت اور عقیدت کا یہ عالم تھا۔ انہوں نے اُوپری دِل سے یہ عہد نہیں کیا تھا۔ یہ واقعی ان کے دِل کی آرزو تھی۔

آنے والے دنوں میں مینا کی مصروفیت بہت زیادہ رہی جس کی وجہ سے اپنے والد کے ساتھ ان کے اُلجھنے کی نوبت نہیں آئی۔ رات کو وہ دیر سے گھر آتیں اور کھانا کھاتے ہی اپنے بیڈروم میں گھس جاتیں جس کے بعد فون پر کمال سے باتیں شروع ہو جاتیں۔ جولائی 1952ء میں مینا کماری کو بے تابی سے ”تماشا“ کی ریلیز کا انتظار تھا۔ یہ ان کی پہلی بڑی فلم تھی جس میں انہوں نے دیو آنند اور اشوک کمار کے ساتھ کام کیا تھا۔ مینا کماری کی اس فلم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں لیکن یہ ریلیز ہوئی تو فلاپ ہو گئی۔ فلمی تبصروں میں ناکامی کی کچھ ذمّہ داری مینا کماری پر بھی آئی اور خود ان کے اپنے ذہن میں بھی شکوک و شبہات پیدا ہو گئے کہ وہ کبھی بڑی ہیروئن بن سکیں گی یا نہیں؟

”بیجو باورا“ کی شوٹنگ کے دوران مینا کماری ایک بار پھر موت کے منہ میں جاتے جاتے بچیں۔ وہ ”اپتا نگر“ میں ”بیجو باورا“ کا گانا ”تو گنگا کی موج میں جمنا کا دھارا“ شوٹ کرا رہی تھیں۔ اس کے لیے وہ اکیلی ایک کشتی میں بیٹھ کر ایک پہاڑی نالے میں جا رہی تھیں جس میں پانی کا بہاؤ خاصا تیز تھا۔ خوبصورت مناظر کے درمیان، حسین موسم میں کشتی رانی کرتے ہوئے مینا کماری کو شاید کچھ لطف آنے لگا اور وہ ماحول میں کھو گئیں۔ غیر ارادی طور پر وہ کشتی کو اس مقام سے کچھ آگے لے گئیں جہاں تک جانے کی انہیں ہدایت کی گئی تھی۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ مزید کچھ آگے اس پہاڑی نالے میں بھنور جیسی ایک جگہ موجود تھی۔ کشتی اگر اس میں چلی جاتی تو مینا کماری سمیت ڈوب سکتی تھی۔

کنارے پر کھڑے سب لوگوں کو خطرے کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ چلا کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر مینا کو کشتی کا رُخ موڑنے کی ہدایت کر رہے تھے لیکن رُخ موڑنا اب مینا کماری کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ کشتی سیدھی بھنور یا گرداب نما حصے کی طرف جا رہی تھی۔ کنارے پر کھڑے لوگوں میں مینا کے والد علی بخش بھی شامل تھے اور انہیں یاد آ رہا تھا کہ مینا کے بچپن میں ایک نجومی نے ان کا ہاتھ دیکھ کر علی بخش کو ہدایت کی تھی کہ اس بچی کو آگ اور پانی سے دُور رکھنا، ان دونوں چیزوں سے اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ علی بخش اس بات کو بھول چکے تھے۔ آج مینا کی زندگی خطرے میں دیکھ کر یہ بات یاد آئی تھی۔ وہ بھی دُوسرے چند لوگوں کے ساتھ کنارے پر دوڑ رہے تھے اور گھبراہٹ میں چیخ پکار کر رہے تھے جس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

مینا کماری کی خوش قسمتی تھی کہ کشتی بھنور تک پہنچنے سے پہلے بے قابو ہو کر دو بڑے پتھروں کے درمیان پھنس گئی۔ فلمی یونٹ کے لوگوں کی جان میں جان آئی اور انہوں نے تھوڑی جدوجہد کے بعد کشتی کو مینا کماری سمیت کنارے پر کھینچ لیا۔ ”بیجو باورا“ کی شوٹنگ کے دوران ہی یہ دلچسپ حقیقت بھی سامنے آئی کہ مینا کماری یوں تو چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑوں سے بھی ڈرتی تھیں لیکن ایک سین کے دوران انہوں نے سانپ کو نہایت اطمینان سے ہاتھوں میں اُٹھا لیا۔ گو کہ اس سانپ کا زہر نکلا ہوا تھا، اس کے باوجود سیٹ پر موجود لوگ انہیں اس طرح بے فکری سے سانپ کے ساتھ ”کھیلتے“ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مینا کماری سمیت، سیٹ پر موجود زیادہ تر لوگوں کو معلوم نہیں تھا کہ سانپ کا زہر نکلا ہوا ہے۔

”بیجو باورا“ کی شوٹنگ کے دوران ہی پہلی بار مینا کماری اور کمال امروہی کے درمیان تھوڑی سی بدمزگی ہوئی۔ کمال امروہی کو احساس تھا کہ ان سے شادی کی وجہ سے مینا کماری کو اپنے گھر میں ہر روز ذلت برداشت کرنا پڑ رہی ہے۔ ایک بار انہوں نے ایک خط میں مینا کو یہ پیشکش کر دی کہ اگر وہ ان کے ساتھ شادی کر کے پچھتا رہی ہوں، تو وہ انہیں طلاق دے سکتے ہیں۔ مینا کماری کو یہ پیشکش بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے جواب میں لکھا ”افسوس، کہ آپ سمجھ ہی نہیں سکے مینا کماری کتنی مضبوط عورت کا نام ہے، اور شاید میں بھی آپ کو نہیں سمجھ سکی۔ بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے طلاق دے دیں۔“

کمال امروہی نے جواب میں لکھا کہ وہ اس کے لیے تیار ہیں، انہیں کوئی دن طے کر کے ان قاضی صاحب کے پاس چلنا چاہیے جنہوں نے ان کا نکاح پڑھایا تھا، وہی ان کی طلاق کی کارروائی بھی کریں گے۔ حیرت انگیز طور پر اس کے بعد مینا کماری نے اس موضوع پر خاموشی اختیار کر لی اور بات آگے نہیں بڑھائی۔ جلد ہی ان کی فلم ”بیجو باورا“ ریلیز ہونے والی تھی۔ ”تماشا“ کی ناکامی کے بعد اب انہوں نے اس فلم سے بہت سی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ مستقبل کے بارے میں ان کے لیے اچھے آثار یہ تھے کہ ان دنوں پریس میں ان کی بڑی تعریفیں ہونے لگی تھیں اور ان کی، آنے والی دونوں فلموں کے بارے میں بہت اچھی توقعات ظاہر کی جا رہی تھیں۔

”فلم فیئر“ جو اس زمانے میں سب سے معتبر اور مؤقر فلمی رسالہ سمجھا جاتا تھا، اس نے ان کے بارے میں لکھا ”ان کی آنے والی دونوں فلمیں ’بیجو باورا‘ اور ’فٹ پاتھ‘ یقیناً ان کے کیریئر کی اہم فلمیں ثابت ہوں گی۔ ان کی وجہ سے دھڑا دھڑ انہیں مزید فلمیں بھی مل رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زبردست اداکارانہ صلاحیتوں کے علاوہ خدا نے انہیں نہایت حسین اور فوٹو جینک چہرے سے بھی نوازا ہے۔ ایسا چہرہ جسے کاسمیٹکس کمپنیوں والے اپنے اشتہاروں میں دکھانا بہت پسند کرتے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کا حُسن میک اپ یا کیمرے کے مخصوص زاویوں وغیرہ کا محتاج نہیں بلکہ فطری ہے۔“

”بیجو باورا“ 5، اکتوبر 1952ء کو ممبئی میں ریلیز ہوئی اور ہر طرف مینا کماری کی دُھوم مچ گئی۔ ممبئی کے بعد پورے ملک میں اس فلم نے ہر صوبے، ہر شہر میں کوئی نہ کوئی ”جوبلی“ ضرور کی۔ درحقیقت فلم کوئی خاص نہیں تھی اور نہ ہی اس میں ہیرو بھارت بھوشن یا ہیروئن مینا کماری نے کوئی کمال دکھایا تھا۔ درحقیقت اس کی غیر معمولی کامیابی میں سب سے زیادہ حصہ موسیقار نوشاد اور گلوکار محمد رفیع کا تھا۔ کمال امروہی نے بھی فلم کی کامیابی پر مینا کو مبارکباد دی۔ فلم اس لحاظ سے بھی مینا کے لیے خوش قسمتی کا باعث تھی کہ ان کی اور کمال کی محبت کے درمیان گزشتہ دنوں جو دراڑ آ گئی تھی، وہ اس کی وجہ سے ختم ہوئی۔ میل ملاقات اور راتوں کو فون پر لمبی گفتگو کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ کمال نے مینا کو بتایا کہ وہ گزشتہ دنوں اس لیے بھی رابطہ نہ رکھ سکے کہ وہ ایک فلم کا اسکرپٹ لکھنے میں مصروف تھے جس میں ہیروئن کا رول لامحالہ مینا کماری کے لیے ہی تھا۔ مینا نے فلم کی کہانی اور نام تک کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور بلا تامل اس فلم کی ہیروئن بننے کے لیے ہامی بھر لی۔

اسی دوران بمل رائے کی فلم ”پرینیتا“ کی مہورت بھی ہو گئی جس کی ہیروئن مینا کماری تھیں۔ کامیابیوں کی شاہراہ پر ان کا سفر تیز تر ہو رہا تھا لیکن انہی دنوں انہیں دو دھچکے بھی برداشت کرنے پڑے۔ ایک تو ان کی فلم ”فٹ پاتھ“ کے کئی نیگیٹو ایک آتشزدگی میں جل گئے۔ دوسرے انہیں ایک فلم ”اُڑن کھٹولا“ میں ہیروئن کے رول کی پیشکش کی گئی تھی لیکن کچھ دنوں بعد ان سے معذرت کر لی گئی۔ انہیں پتا چلا کہ وہ رول نمّی کو دے دیا گیا تھا۔ (جاری ہے)

والد کے گھر کے دروازے اُن پر بند ہوگئے

قسط:9

شاید قسمت کی طرف سے ان کے لیے یہ دو دھچکے ہی کافی نہیں تھے۔ ایک اور دل شکن واقعہ یہ ہوا کہ 31ء اکتوبر 1952ء کو ''فلم فیئر'' نے ایک مقابلۂ حسن منعقد کرایا۔ اس کے ججوں میں فلم پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز وغیرہ شامل تھے۔ حیرت انگیز طور پر اس میں حسن کے اعتبار سے پہلے نمبر پر نلنی جیونت، دُوسرے نمبر پر نرگس اور تیسرے نمبر پر مدھوبالا کو رکھا گیا۔ اس فہرست میں بے چاری مینا کماری کا نمبر آٹھواں تھا۔ نہ جانے ججوں کے انتخاب کا پیمانہ کیا تھا۔ اس ترتیب پر سبھی کو حیرت ہوئی۔

بہرحال اس زمانے میں مینا کماری کے پاس اتنی فلموں کی آفرز آرہی تھیں کہ سب کے لیے ڈیٹس دینا علی بخش کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ بہت سے لوگوں سے انہیں معذرت کرنا پڑتی تھی۔ ''نولکھا ہار، دانا پانی، بینک منیجر، الزام اور امر''، وہ فلمیں تھیں جن کے کنٹریکٹ علی بخش نے انہی دنوں مینا کماری کی طرف سے سائن کیے۔ اس سے پہلے بھی فلموں کے کنٹریکٹ مینا کماری کی طرف سے علی بخش ہی سائن کرتے تھے۔ انہی دنوں جب وہ اتنی فلمیں سائن کر رہے تھے، ایک فلم ایسی بھی تھی جس کے لیے مینا کماری ہامی بھر چکی تھیں لیکن ان کے والد علی بخش نے اس کے کنٹریکٹ پر سائن نہیں کیے اور ٹال مٹول سے کام لیتے رہے۔ یہ فلم کمال امروہی کی تھی اور اس کا نام ''دائرہ'' طے پایا تھا۔ آخر کار اسی فلم کی وجہ سے ایک دن ایسا بھی آیا جب مینا کماری نے اپنے والد کا گھر چھوڑ دیا۔

14ء فروری 1953ء کو مینا کماری کھنڈالا میں مقیم تھیں۔ یہ ایک پہاڑی مقام تھا اور مینا وہاں دو تین دن کی تعطیلات گزارنے گئی ہوئی تھیں۔ اس تاریخ کو ان کی شادی کی پہلی سالگرہ بھی تھی۔ انہوں نے کھنڈالا سے کمال امروہی کو فون کیا کہ ان کے درمیان طلاق کی جو بات ہوئی تھی، وہ اسے ختم سمجھیں۔ وہ اس بات کو آگے بڑھانا نہیں چاہتیں۔ کمال امروہی نے اس پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ خود بھی انہیں طلاق دینے کے، دل سے خواہشمند نہیں ہیں۔ یوں ان دونوں کے درمیان جو ایک ناخوشگوار صورتحال پیدا ہوئی تھی، وہ ٹل گئی۔

تاہم جب مینا کماری کھنڈالا سے واپس آئیں تو ایک اور ناخوشگوار صورتحال ان کا انتظار کر رہی تھی۔ انہوں نے اپنے والد کو بتایا کہ وہ اپنے شوہر کی فلم ''دائرہ'' کی شوٹنگ شروع کرنے والی ہیں۔ علی بخش نے فوراً کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تو یہ ڈیٹس محبوب صاحب کو دے چکا ہوں۔ تمہیں کل سے روزانہ ان کی فلم ''امر'' کی شوٹنگ کے لئے جانا ہے۔''

اس کے ساتھ ساتھ علی بخش نے بیٹی کو یہ بھی یاد دلایا کہ محبوب صاحب ایک بہت بڑے اور قابل ڈائریکٹر تھے، ان کی فلم مینا کے کیریئر اور مستقبل کے لئے بہت اہم تھی۔ فلم کی دوسری اہم بات یہ تھی کہ اس میں مینا کے مقابل دلیپ صاحب ہیرو تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

مینا کماری نے اس وقت تو بادل ناخواستہ والد کی بات مان لی اور محبوب صاحب کی فلم کی شوٹنگ کے لئے جانا شروع کر دیا لیکن پانچ دن بعد ہی انہوں نے کسی بات پر محبوب صاحب سے جھگڑا کر لیا اور اسے جواز بنا کر شوٹنگ کے لئے جانا چھوڑ دیا۔ دو تین دن بعد انہوں نے اپنے والد کو مطلع کیا کہ وہ بمبئی ٹاکیز اسٹوڈیو جانا شروع کر رہی ہیں، جہاں ان کے شوہر کی فلم ''دائرہ'' کی شوٹنگ کا آغاز ہو رہا ہے۔ علی بخش نے انہیں خبردار کیا کہ اگر وہ اس فلم کی شوٹنگ کے لئے گئیں تو باپ کے گھر کے دروازے ان پر ہمیشہ کے لئے بند ہو جائیں گے۔

مینا کماری پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہ ہوا اور جس روز انہیں شوٹنگ کے لئے بلاوا آیا، وہ بمبئی ٹاکیز روانہ ہو گئیں۔ دن بھر شوہر کی ہدایتکاری میں شوٹنگ کرنے کے بعد وہ واپس آئیں تو واقعی گھر کا دروازہ ان کے لئے بند تھا۔ ان کی بہن مدھو دروازے پر آئی لیکن اس کے پیچھے پیچھے ان کے والد علی بخش بھی چلے آئے اور انہوں نے مدھو کو دروازہ کھولنے سے سختی سے منع کر دیا۔ مدھو نے والد کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جس طرح مینا کماری پر والد کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، اسی طرح والد پر بھی مدھو کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

آخر کار مینا کماری نے مدھو سے کہا کہ وہ ان کی چند ساڑھیاں انہیں لا دے۔ مدھو نے ان کے کپڑوں کی الماری سے چند ساڑھیاں انہیں لا دیں۔ مینا کماری نے ساڑھیاں اپنی گاڑی میں رکھیں اور باپ کے گھر پر ایک الوداعی نظر ڈال کر آنکھوں میں آنسوؤں کی دھندلاہٹ لئے وہاں سے کمال امروہی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئیں جو سیون (Sion) کے علاقے میں تھا۔

وہ کمال امروہی کے گھر پہنچیں تو کمال گھر پر نہیں تھے، تاہم ان کے ملازم نے مینا کماری کو اندر آنے دیا۔ ''صاحب کا بیڈ روم کہاں ہے؟'' مینا نے پوچھا۔

ملازم نے سعادت مندی سے ''صاحب کا بیڈ روم'' انہیں دکھا دیا۔ مینا کماری نے اپنی تمام ساڑھیاں اس بیڈ روم کی الماری میں لٹکا دیں۔ اتفاق سے ان دنوں کمال امروہی کی بیگم اور بچے امروہہ گئے ہوئے تھے۔ مینا کماری شاور لینے باتھ روم چلی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد کمال امروہی آن پہنچے۔ وہ خود ہی چابی سے تالا کھول کر گھر میں داخل ہوئے تو عین اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ یہی سمجھے کہ مینا کماری کی کال ہوگی۔ وہ لپک کر فون تک پہنچے لیکن ریسیور اٹھانے کے بعد انہیں پتا چلا کہ وہ رانگ نمبر کال تھی۔ قدرے مایوسی اور بدمزگی کی کیفیت میں ریسیور رکھ کر وہ واپس مڑے تو کمرے کے دروازے پر انہوں نے مینا کماری کو کھڑے پایا جو غسل کے بعد لباس تبدیل کر کے تولیہ بالوں پر لپیٹے ہوئے تھیں۔

کمال امروہی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ ساری بات معلوم ہونے کے بعد ان کی حیرت دور ہو گئی۔ انہوں نے مینا کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ انہوں نے بالکل درست قدم اٹھایا تھا۔ انہوں نے مینا کو یہ تسلی بھی دی کہ انہیں اپنے والد کی طرف سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی، وہ اب ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔

اس رات مینا کماری نے اپنے والد کے نام خط لکھا۔ ''بابوجی! جو کچھ ہوا، کیوں ہوا، میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتی۔ بہرحال میں نے گھر چھوڑ دیا ہے اور اب میں واپس نہیں آؤں گی۔ براہ مہربانی عدالت وغیرہ میں جانے کا خیال دل میں مت لائیے گا۔ یہ ایک بچگانہ حرکت ہوگی، اس سے رسوائی اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مجھے آپ کے گھر سے اپنے باقی کپڑوں اور کتابوں کے سوا کچھ نہیں چاہئے۔ میرے پاس جو گاڑی ہے، یہ بھی میں کل آپ کو بھجوا دوں گی۔ آپ میرے کپڑے اور کتابیں اپنی سہولت کے مطابق، جب چاہیں بھجوا دیجئے گا۔ خط یا فون کے ذریعے جواب دیجئے گا۔ مینا۔''

علی بخش یہ خط پڑھ کر بدحواس ہو گئے۔ انہیں مینا کماری سے اس ثابت قدمی کی امید نہیں تھی۔ انہوں نے بیٹی سے صلح کی کوششیں شروع کر دیں لیکن مینا نے اب ان کے ساتھ کوئی تعلق رکھنے سے انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ وہ اب صرف اپنے شوہر کے ساتھ رہیں گی۔ یہ تمام مسئلے مسائل اپنی جگہ تھے لیکن مینا اس دوران اپنا کام باقاعدگی سے کر رہی تھیں۔ اس عرصے میں کمال امروہی سے ان کی شادی کی خبر عام ہو چکی تھی۔

ایک اخبار نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ ''مینا کماری کو ایک خاموش طبع اور کم گو لڑکی سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے جس طرح اپنی شادی کی خبر کو ایک سال تک چھپائے رکھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ واقعی صرف خاموش طبع اور کم گو ہی نہیں بلکہ بڑی ''گھنی'' بھی ہیں۔''

جن دنوں مینا کماری کی شادی راز تھی، ان دنوں بھی وہ کام میں مصروف رہیں اور جب یہ خبر عام ہو گئی، تب بھی وہ مسلسل کام کر رہی تھیں۔ انہیں ہنی مون پر جانا نصیب نہیں ہوا۔ انہوں نے نومبر 1953ء تک ''فٹ پاتھ''، ''پرینیتا''، ''دائرہ''، ''دانا پانی'' اور ''نولکھا ہار'' مکمل کرا دیں۔ پیٹریشیا پیریرا نامی ایک فلمی صحافی خاتون نے ایک بار ان سے پوچھا۔ ''آپ نے اتنے کم وقت میں اتنی فلمیں کیسے مکمل کرا دیں؟''

مینا کماری نے جواب دیا۔ ''میں سورج طلوع ہونے پر کام شروع کرتی ہوں اور جب ختم کرتی ہوں، اس وقت آدھی رات گزر چکی ہوتی ہے۔''

جب سے وہ کمال امروہی کے گھر میں آئی تھیں، ان کے لئے فلموں کے اسکرپٹ دیکھنے، معاملات طے کرنے، معاوضہ وصول کرنے، کنٹریکٹ سائن کرنے، ڈیٹس دینے اور اس طرح کے دیگر تمام متعلقہ کام کمال اور باقر نے سنبھال لئے تھے۔ شاید اس وجہ سے بھی مینا کماری کے کام کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ کمال اور باقر کسی سخت گیر باس کی طرح مینا کماری کو مصروف رکھتے تھے۔ مینا کماری نے اپنی پوری زندگی میں 75ء فلمیں کیں۔ ان میں سے 50ء انہوں نے کمال امروہی کے گھر میں اپنے گیارہ سالہ قیام کے دوران کیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کمال کی بیوی کی حیثیت سے ان کے کام کی رفتار کیا تھی۔ اس زمانے میں وہ بیک وقت چار پانچ فلموں میں کام کر رہی ہوتی تھیں۔

کمال امروہی کے گھر میں مینا کماری کا پہلا سال خوشیوں اور طمانیت کا سال تھا۔ ان کے والد نے انہیں واپس لانے کی کوششیں ترک کر دی تھیں اور حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ مینا کی چھوٹی بہن مدھو نے بھی اپنی زندگی کا ساتھی تلاش کر لیا تھا اور وہ اس سے شادی کر کے ہنسی خوشی دن گزار رہی تھیں۔ ان کے جیون ساتھی اداکار محمود تھے۔ اسی سال یعنی 1953ء میں ہی لکس ٹوائلٹ سوپ کے لئے ''ہندوستان لیور'' نے مینا کماری سے ماڈلنگ کرائی۔ اس زمانے میں بھی کسی اداکارہ کے لئے لکس کی ماڈلنگ کرنا ایک اعزاز ہوتا تھا۔

کمال امروہی کی پہلی بیوی نے مینا کماری سے ان کی شادی پر خاصا ہنگامہ کیا تھا لیکن جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ کمال نے انہیں امروہہ سے واپس نہیں بلایا۔ وہ اپنے تین بچوں کے ساتھ وہیں رہتی رہیں لیکن غصے اور ذہنی کشیدگی کے باعث انہیں ڈپریشن کے دورے پڑنے لگے۔ بہرحال انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ امروہہ میں ہی گزارا۔

مینا کماری نے جب اپنے والد کا گھر چھوڑا، اس سے کچھ عرصہ قبل اسٹوڈیو میں ایک خوبصورت لڑکی کسی طرح مینا کے پاس پہنچی۔ اس کا نام فردوس تھا۔ وہ کچھ اچھے حال میں نہیں تھی۔ اس نے مینا کو بتایا کہ وہ ایک بے سہارا اور مصیبت زدہ لڑکی ہے۔ اس کا کوئی گھربار نہیں ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ کہاں جائے؟ مینا کماری کچھ زیادہ ہی رحمدل تھیں، انہوں نے اسے نئے کپڑے وغیرہ دلائے اور اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ انہوں نے ماہانہ تنخواہ پر فردوس کو آیا کے طور پر رکھ لیا۔ اسٹوڈیو آتے وقت وہ اسے ساتھ لے آتیں۔ اسٹوڈیو میں وہ کوئی خاص کام نہیں کرتی تھی، بس مینا کماری کے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔

(جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
محبت نے انہیں دنیا سے
بیگانہ
کردیا تھا
itsurdu.blogspot.com

محبت نے انہیں دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا

قسط:10

ایک بار باقر نے علیحدگی میں مینا کو مشورہ دیا کہ وہ فردوس کو اپنے ساتھ اسٹوڈیو نہ لایا کریں۔ لڑکی شکل وصورت کی اچھی ہے، اسٹوڈیو میں اس کے ساتھ کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔ مینا نے یہ مشورہ مان لیا اور فردوس کو گھر تک ہی محدود کر دیا۔ جب مینا کماری، کمال امروہی کے گھر آ گئیں تو فردوس پیچھے ان کے والد کے گھر میں ہی رہ گئی۔ کچھ دنوں بعد مینا کو پتا چلا کہ ان کے والد علی بخش نے اس لڑکی کو شادی کی پیشکش کی ہے اور وہ تقریباً آمادہ بھی ہو گئی ہے۔ مینا کماری کو یہ خبر سن کر بہت غصہ آیا۔ انہوں نے اپنے والد کے نام ایک سخت پیغام بھیجا کہ اس بڑھاپے میں انہیں اپنی بیٹی سے بھی چھوٹی عمر کی لڑکی سے شادی کرتے ہوئے شرم نہیں آ رہی؟ اس کے ساتھ ہی انہوں نے فردوس کا کہیں اور کوئی بندوبست کر دیا اور اپنا بچا کھچا سامان بھی والد کے گھر سے منگوا لیا۔ اب گویا ان کی اپنے والد سے علیحدگی بالکل مکمل ہو گئی تھی۔ اس کے بعد عمر رسیدہ علی بخش گھر میں بالکل تنہا رہ گئے۔

کمال امروہی نے اس دوران سیون کے علاقے والا گھر چھوڑ کر پالی ہل کے علاقے میں ایک بلڈنگ اپارٹمنٹ لے لیا۔ ایک مشہور زمانہ فرانسیسی مصور کے نام پر اس عمارت کا نام "ریمبراں" تھا۔ کمال امروہی اور مینا کماری کے درمیان اس کے بعد جتنی بھی رفاقت رہی، وہ اسی عمارت کی دوسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں رہی۔ اس بلڈنگ میں لفٹ نہیں تھی۔ آج یہ ایک گنجان آباد علاقہ ہے اور فلک بوس عمارتوں سے بھرا پڑا ہے، لیکن 1950ء کی دہائی میں یہاں خال خال ہی بنگلے اور عمارتیں دکھائی دیتی تھیں۔ آج پالی ہل کو ممبئی میں وہی حیثیت حاصل ہے جو ہولی وڈ میں سن سیٹ بلیوارڈ کو ہے۔ فلمی دنیا کے بیشتر نامی گرامی لوگ اسی علاقے میں رہتے ہیں۔

"ریمبراں" نامی بلڈنگ کے اس فلیٹ میں مینا کماری نے کمال امروہی کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کے غالباً صرف دو یا تین ابتدائی سال ہنسی خوشی گزارے۔ مینا کماری کے نزدیک یہی دو تین سال زندگی کا حاصل تھے۔ اس کے بعد بھی گو کہ وہ مزید نو دس سال اکٹھے رہے لیکن اس دوران خوشی، محبت اور سکون ان کی زندگی سے رخصت ہو چکا تھا۔

رفاقت کے ابتدائی دو تین برس ایسے تھے جن کے دوران مینا کماری کو کمال امروہی میں سقراط کی سی ذہانت اور دانشوری، کسی یونانی دیوتا کی سی خوب صورتی اور راجیش کھنہ جیسی کشش محسوس ہوتی تھی۔ دونوں میاں بیوی کو جتنا بھی فارغ وقت میسر آتا، وہ بصد شوق ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے، تاش کھیلتے، باتیں کرتے اور اگر باتوں کے دوران وقفہ آ جاتا تو خاموشی کے وہ لمحات محض عاشقانہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے گزارنے میں بھی ایک انوکھی لذت محسوس کرتے۔ کبھی کبھی وہ دونوں کوئی انگریزی فلم دیکھنے چلے جاتے۔ محبت نے مینا کماری کو گویا دنیا سے بیگانہ کر دیا تھا۔

مینا کماری نے اپنی زندگی کے اس دور میں، پہلے سال اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھا۔ "کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ میں کتنی خوش اور کتنی خوش نصیب ہوں۔ انسان جس سے محبت کرے، اسے حاصل بھی کر لے، اس سے بڑی خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی ہے؟ بعض لوگ میری طرف ترحم بھری نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ میں نے ایک ایسے آدمی سے محبت کی تھی جو پہلے سے شادی شدہ اور بچوں والا تھا، لیکن میں بہت خوش ہوں، کیونکہ کمال بالکل ویسے ہی ثابت ہوئے جیسا میرے ذہن میں ان کا تصور تھا، جیسا میں ان کے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ مجھے یقین ہے وہ بھی میرے بارے میں ایسا ہی محسوس کرتے ہوں گے۔ ہماری اس محبت کا عکس ہماری فلم "دائرہ" میں بھی دیکھا جا سکتا ہے، جو ہم نے حال ہی میں مکمل کی ہے۔"

یہ لفاظی یا مبالغہ آرائی نہیں ہے۔ انسان جب سچ مچ محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کے محسوسات ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں مینا کماری، کمال کے چپل اٹھا کر لانے اور اپنے ہاتھوں سے انہیں پہنانے میں بھی خوشی محسوس کرتی تھیں۔ اس زمانے میں اگر ایک ہی اخبار پر وہ دونوں جھک کر بیک وقت اسے پڑھتے تھے تو اس میں بھی ایک انوکھا لطف آتا تھا۔

1953ء میں مینا کماری کی چھ فلمیں ریلیز ہوئیں، ان میں سے صرف تین قابل ذکر ہیں۔ دائرہ، فٹ پاتھ اور پرنیتا۔ ان میں سے بھی پہلی دو تو معیاری اور قابل دید ہونے کے باوجود فلاپ تھیں، جبکہ تیسری، یعنی "پرنیتا" نے اوسط درجے کا بزنس کیا تھا۔ تاہم یہ تینوں فلمیں اس اعتبار سے قابل ذکر ہیں کہ ان میں مینا کماری نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ایک نہایت اعلیٰ درجے کی فنکارہ ہیں۔

مشہور انڈین فلمی رسالہ "فلم فیئر" 1952ء میں شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ 1954ء میں اس نے فلم انڈسٹری کے لئے اپنے پہلے ایوارڈ کا اعلان کر دیا۔ ایوارڈز کی پہلی تقریب کے لئے دھوبی تلاؤ کے علاقے میں واقع میٹرو سینما کو منتخب کیا گیا۔ تقریب کے لئے خاص طور پر نئے سرے سے اس کی تزئین و آرائش کی گئی۔ خصوصی صفائی اور نیا رنگ و روغن بھی کیا گیا۔ پہلے ہی ایوارڈ میں بہترین اداکارہ کے لئے مینا کماری کو نامزد کیا گیا اور اسی وقت سے عام لوگوں کو بھی یقین ہو گیا کہ ایوارڈ انہی کو ملے گا۔ کوئی اور اداکارہ ان کا مقابلہ کر ہی نہیں پائے گی۔

ایوارڈ کی اس تقریب میں مینا کماری سفید ساڑھی پہن کر اور بالوں میں پھول سجا کر شریک ہوئیں۔ بعد میں تقریباً ہمیشہ کیلئے تقریبات میں شرکت کرتے وقت سفید ساڑھی زیب تن کرنا مینا کماری کی عادت رہی اور یہ ان کی پہچان بن گئی۔ ہر تقریب میں مینا کی سفید ساڑھی نئی ہوتی تھی۔ انڈیا میں تعینات امریکی سفیر مسٹر جارج ایلن اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ مینا کماری کو فلم "بیجو باورا" پر بہترین اداکارہ کا ایوارڈ مسٹر کے ڈبلیو شروتی نے دیا، جن کے بارے میں کسی کو یاد نہیں کہ وہ کون تھے۔

فلموں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو 1954ء مینا کماری کیلئے کسی خاص کامیابی کا سال نہیں تھا۔ اس سال ان کی تین فلمیں، بادبان، الزام اور چاندنی چوک ریلیز ہوئیں۔ ان میں سے صرف چاندنی چوک، ذرا قابل ذکر تھی جس کے ہدایت کار بی آر چوپڑا تھے۔ ان کا نام ان دنوں فلموں میں نیا تھا۔ وہ آنجہانی یش چوپڑا کے بڑے بھائی تھے، ان کی اس پہلی فلم میں بھی مینا کماری کی اداکاری کو بہر حال سب سے زیادہ سراہا گیا۔ اس سال بھی فلم فیئر ایوارڈ ان کے نام رہا لیکن یہ ان کی فلم "پرنیتا" پر تھا۔ انہیں خود بھی مشکل سے یقین آیا کہ دوسرے سال بھی فلم فیئر ایوارڈ انہی کے حصے میں آیا تھا۔

1955ء مینا کماری کیلئے بے پناہ مصروفیت کا سال تھا۔ ایک بار انہوں نے خود کہا۔ "ایسا لگتا ہے کہ میرے پاس اپنی ذات کیلئے ایک لمحہ بھی نہیں ہے۔" تاہم یہ بات انہوں نے شکوے کے طور پر نہیں کہی تھی اور نہ ہی انہیں اپنی مصروفیت پر کوئی تاسف تھا۔ مصروفیت کی زندگی گزارنا انہیں پسند تھا۔ اس سال وہ سات فلموں کی شوٹنگ میں مصروف رہیں۔ یہ فلمیں تھیں، امر اؤ جان ادا، بندش، شطرنج، رخسانہ، آزاد، عدلِ جہانگیری اور "میم صاحب"۔

اسی زمانے میں مینا کماری کے ساتھ ساتھ ایک اداکار بھی شہرت کے مدارج طے کر رہا تھا۔ اس کا نام بلراج تھا لیکن بعد میں اس نے اپنا نام تبدیل کر کے سنیل دت رکھ لیا تھا۔ جی ہاں، وہی سنیل دت جنہیں آپ نرگس کے شوہر اور سنجے دت کے والد کی حیثیت سے جانتے ہوں گے۔ اس وقت تک ان کی زیادہ شہرت ایک اناؤنسر اور کمپیئر کے طور پر تھی۔ جس تقریب میں مینا کماری کو دوسرا فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا، اس کی کمپیئرنگ سنیل دت ہی کر رہے تھے۔ مرار جی ڈیسائی اس تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔

مینا کماری کی 1955ء کی فلموں میں "آزاد" کامیاب رہی، جس میں دلیپ کمار ان کے ہیرو تھے، جن کا کردار اس فلم میں ایک قسم کے ہندوستانی رابن ہڈ کا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ مدراس کے خوبصورت علاقوں میں ہوئی، جس کے دوران مینا کماری کو فرصت کے چند دن سیر و تفریح میں گزارنے کا بھی موقع مل گیا۔

اس دوران کمال امروہوی بذریعہ ہوائی جہاز ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ممبئی سے باہر کسی شوٹنگ کے دوران کمال امروہی ان کے پاس آئے تھے، ورنہ بیرون شہر شوٹنگ میں صرف باقر اور مدھو، مینا کماری کے ساتھ رہتے تھے۔

مدراس، جو اب چنائے کہلاتا ہے۔ اس کے بعض نہایت خوبصورت، خاموش اور پرسکون علاقوں کی سیر کے دوران کمال امروہوی کے ذہن میں ایک فلم کا دھندلا خاکہ ابھرا۔ مدراس میں اپنے قیام کے دوران کمال امروہوی اپنے ذہن میں اس فلم کا تانا بانا تو نہیں بن سکے۔ لیکن انہوں نے یہ ضرور سوچ لیا کہ وہ اس کا نام "پاکیزہ" رکھیں گے۔ دو ہفتے بعد میاں بیوی ممبئی لوٹ آئے۔

مینا کماری کو پارٹیوں وغیرہ میں جانا بالکل پسند نہیں تھا۔ خاص طور پر ایسی پارٹیوں میں، جن میں "ہلا گلا" ہوتا تھا اور جو رات گئے تک جاری رہتی تھیں۔ اگر انہیں فارغ وقت میسر آتا تھا تو وہ پرسکون انداز میں گھر پر کمال کے ساتھ رہنا پسند کرتی تھیں اور اگر کمال مصروف ہوتے تھے، گھر پہ نہیں ہوتے تھے تو مینا عموماً کتابوں کے مطالعے یا کچھ لکھنے لکھانے میں وقت گزارتی تھیں۔ ان کے مزاج میں تنہائی پسندی تھی، جس کی وجہ سے بعض لوگ انہیں مغرور بھی سمجھتے تھے۔ فلموں سے چونکہ انہیں دلچسپی تھی، اس لئے بعض فلموں کے پریمیئر شو پر چلی جاتی تھیں لیکن بعد میں اس مقصد کے لئے بھی انہوں نے گھر پہ پروجیکٹر لگوا لیا تھا۔ جو فلم دیکھنی ہوتی تھی، پروڈیوسر سے اس کا پرنٹ منگوا کر گھر پر ہی دیکھ لیتی تھیں۔ شوٹنگ کے دوران بھی اگر انہیں وقفہ میسر آتا تھا تو وہ کسی کونے کھدرے میں کسی پرانے شاعر کا کلام یا کوئی ادبی کتاب پڑھتی پائی جاتی تھیں۔

1956ء میں، جبکہ مینا کماری اور کمال امروہی کی شادی کو در حقیقت چار سال، لیکن انہیں باقاعدہ طور پر ساتھ رہتے ہوئے تین سال گزر چکے تھے، ان کی باہمی محبت کچھ کم ہونے لگی۔ مینا کماری کو شکوہ ہونے لگا کہ کمال کے رویے میں اب ان کیلئے پہلی سی گرمجوشی نہیں رہی تھی۔ اس کے جواب میں کمال کا کہنا تھا کہ مینا کو واہمے ستانے لگے تھے۔ ان کے خیال میں یہ فطری سی بات تھی کہ انسان کی شادی کو تین سال گزر جاتے ہیں تو نجی زندگی میں اس کے انداز و اطوار شادی کے شروع کے دنوں جیسے نہیں رہتے۔ کچھ نہ کچھ فرق تو آ ہی جاتا ہے لیکن مینا نے اس بات کو کچھ زیادہ ہی محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔

کمال کا کہنا تھا "یہ درست ہے کہ اب میں ہر روز صبح اٹھ کر مینا سے یہ نہیں کہتا "بیگم! مجھے تم سے دلی محبت ہے۔" لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے دل میں اس کیلئے محبت کم ہو گئی ہے۔ دراصل میرے خیال میں ہمارے درمیان محبت کا تعلق اتنا مضبوط اور یقینی ہے کہ میں ہر روز صبح اٹھ کر زبان سے اس کی باقاعدہ تصدیق کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، شاید یہ میری غلطی ہے۔"

ایک اور چیز ان کے درمیان دوری پیدا کر رہی تھی۔ وہ تھا مینا کماری کا کام۔ ان کی فلمی مصروفیات کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھ رہی تھیں۔ کمال امروہی کا موقف تھا کہ انہوں نے جب مینا سے شادی کی تو اس پر واضح کر دیا تھا "میرے گھر میں تم مینا کماری کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ماہ جبیں کی حیثیت سے قدم رکھو گی۔ یعنی میرے گھر میں تم ایک فلم اسٹار نہیں بلکہ گھریلو قسم کی بیوی ہو گی۔"

کمال کا کہنا تھا کہ اس کے جواب میں مینا نے کہا تھا "فلمی دنیا کو خیر باد کہنے کیلئے مجھے کچھ وقت درکار ہو گا۔ ابھی میرے اپنے گھر کے مالی حالات زیادہ اچھے نہیں، جب میں اپنے گھر والوں کے مستقبل کے بارے میں مطمئن ہو جاؤں گی تو فلمی دنیا کو خیر باد کہہ کر ایک گرہستن عورت کی طرح ہانڈی چولہا بھی کروں گی اور بازار سے آلو ٹماٹر بھی خرید کر لایا کروں گی۔"

کمال امروہی کا کہنا تھا کہ مینا کماری نے اپنا یہ وعدہ پورا نہیں کیا۔ بعض لوگوں کے خیال میں یہ اچھا ہی ہوا، ورنہ اردو فلم انڈسٹری مینا کماری جیسی اداکارہ اور اس کی یادگار فلموں سے محروم ہو جاتی۔ کمال امروہی بتاتے ہیں کہ مینا سے جب ان کی اس موضوع پر بات ہوئی تو مینا نے تسلیم کیا کہ انہوں نے شادی کے بعد شوبز چھوڑنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب شوبز کو چھوڑنا ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ انہیں میرے علاوہ اپنے کام سے بھی عشق ہو گیا تھا۔ انہوں نے یہاں تک بھی کہہ دیا کہ اگر آپ زیادہ اصرار کریں گے اور مجھے شوبز چھوڑنے پر مجبور کریں گے تو میں آپ سے طلاق کا مطالبہ کروں گی۔

کمال امروہی کا کہنا تھا "مجھے مینا کماری کی یہ بات سن کر غصہ نہیں آیا۔ مجھے اس کی صاف گوئی اچھی لگی۔ جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ اس نے زبان سے کہا۔ منافقت سے کام نہیں لیا۔ میں نے ٹھنڈے دل سے صورت حال پر غور کیا۔ پھر اس سے کہا "ٹھیک ہے... آپ فلموں میں کام جاری رکھیں لیکن اس کیلئے آپ کو میری تین شرائط ماننی ہوں گی۔ پہلی یہ کہ آپ روزانہ شام ساڑھے چھ تک گھر آ جایا کریں گی۔ دوسری یہ کہ آپ کے میک اپ روم میں میک اپ مین کے علاوہ کوئی نہیں آئے گا۔ آپ صرف اپنی کار میں بیٹھ کر اسٹوڈیو میں جایا کریں گی اور اسی میں گھر واپس آیا کریں گی۔ کسی اور کی کار میں نہ تو گھر سے اسٹوڈیو جائیں گی اور نہ ہی کسی دوسرے کی کار آپ کو گھر چھوڑنے آئے گی۔ میں نے یہ تینوں شرائط باقاعدہ تحریری صورت میں مینا کماری کے سامنے رکھ دیں۔ انہوں نے بلا تامل ان پر دستخط کر دیئے۔ میں بہت خوش ہوا کہ انہوں نے میری تینوں باتیں مان لی تھیں۔ لیکن انہوں نے دوسرے ہی روز سے ان شرائط کی خلاف ورزی شروع کر دی۔"

(جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
اُن کی
ازدواجی زندگی
کی بُنیاد پر ہلنے لگیں
itsurdu.blogspot.com

ان کی ازدواجی زندگی کی بنیادیں ہلنے لگیں

قسط:11

فلموں کی کامیابی کے اعتبار سے 1956ء مینا کماری کے لیے کوئی اچھا سال نہیں تھا۔ اس سال ریلیز ہونے والی، ان کی فلموں کی تعداد تو اچھی خاصی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی کامیاب اور معیاری نہیں تھی۔ تاہم مینا کماری کی اداکاری ان میں بھی لاجواب تھی۔ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں پر کسی نے تنقید نہیں کی۔ ناکام فلموں کی اس قطار کے بعد ان کی فلم ''شاردا'' ریلیز ہوئی جو بے حد کامیاب رہی۔ اس میں پہلی بار راج کپور ان کے مقابل ہیرو آئے اور اس فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں ہی مینا کماری نے زندگی میں پہلی بار راج کپور کو سیٹ پر دیکھا۔

اس فلم میں مینا کماری نے منفرد اداکارہ ہونے کا ایک اور ثبوت دیا۔ فلم میں ان کا ایک طرح سے ڈبل رول تھا لیکن بطور اداکارہ یہ ان کی انفرادیت نہیں تھی۔ انفرادیت یہ تھی کہ فلم کے پہلے آدھے حصے میں وہ راج کپور کی ہیروئن تھیں اور دوسرے آدھے حصے میں ان کی والدہ۔ دونوں کرداروں میں ان کی اداکاری کو بہت سراہا گیا۔ فلم میں وہ دوسرے تمام عناصر بھی موجود تھے جو عموماً کسی فلم کو کامیاب بناتے ہیں۔

ایک طرف بطور اداکارہ مینا کماری کا ایک اعلیٰ مقام متعین ہو رہا تھا لیکن دوسری طرف ان کی ازدواجی زندگی کی بنیادیں ہلنا شروع ہو گئی تھیں۔ اس میں مینا کماری کی ضد، سرکشی اور ایک قسم کے بچگانہ پن کو زیادہ دخل تھا۔ انہوں نے کمال امروہی کی جن تین شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے، ان پر دستخط کیے تھے، انہیں وہ عملی طور پر ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات نے بھی ان کی گھریلو زندگی کی بنیادوں میں دراڑیں ڈالنا شروع کر دی تھیں۔ مثال کے طور پر ایک واقعے کا تذکرہ کرتے چلیں۔

''شاردا'' کی شوٹنگ راج کپور کے اپنے ''آر۔ کے اسٹوڈیو'' میں چل رہی تھی۔ اسی دوران روس سے فلمی لوگوں کا ایک وفد انڈیا آیا ہوا تھا اور راج کپور نے ان کے اعزاز میں اپنے گھر پر ایک پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے مینا کماری کو بھی اس پارٹی میں شرکت کی دعوت دی جو انہوں نے قبول کر لی لیکن گھر پہ کمال کو فون کر کے بتایا کہ وہ کام کی وجہ سے لیٹ ہو جائیں گی۔ پارٹی کا انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ دوسرے روز کمال کے کوئی شناسا ان سے ملے تو باتوں باتوں میں انہوں نے ذکر کیا کہ گزشتہ رات راج کپور کے ہاں پارٹی میں ان کی ملاقات مینا کماری سے ہوئی تھی۔ کمال امروہی کو یہ بات اچھی نہیں لگی کہ کسی پارٹی میں مینا کماری کی موجودگی کے بارے میں انہیں خود مینا کماری کے بجائے، کوئی اور مطلع کر رہا تھا۔ انہوں نے مینا سے اس بارے میں استفسار کیا تو انہوں نے بے پروائی سے کہہ دیا ''پارٹی کا ذکر میں نے اس لیے نہیں کیا کہ کہیں آپ پریشان نہ ہو جائیں۔''

اس کے کچھ عرصے بعد اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہو گیا۔ پردیپ کمار نے نئی کرسلر کار خریدی تھی۔ انہوں نے ''آزمائشی'' طور پر مینا کماری کو اپنی گاڑی میں چند میل کا چکر لگانے کی دعوت دی۔ کاریں مینا کماری کی کمزوری تھیں۔ وہ اس نئی امپورٹیڈ کار میں سیر کرنے کے لیے چل دیں۔ جب وہ باندرہ کے علاقے میں پہنچیں تو انہوں نے بہتر سمجھا کہ ٹیکسی لے کر گھر چلی جائیں۔ اس دوران ان کی اپنی گاڑی ان کے پاس نہیں تھی۔ وہ پردیپ کمار کی گاڑی سے اتر کر ٹیکسی میں بیٹھیں تو اتفاقاً وہاں سے گزرتے ہوئے باقر نے یہ سارا منظر دیکھ لیا۔ وہ کمال کے سیکریٹری، دوست، رازدار، سبھی کچھ تھے۔ ظاہر ہے انہوں نے کمال سے اس بات کا ذکر کیا، غلط فہمیوں کا سلسلہ کچھ اور دراز ہوا۔

اُدھر میک اپ روم کے بارے میں بھی کمال امروہی نے شرط عائد کی تھی کہ مینا کماری میک اپ مین کے سوا کسی کو اندر نہیں آنے دیں گی۔ اس شرط پر بھی شاید ہی کبھی عملدرآمد ہوا ہو۔ مینا کماری کے میک اپ روم میں ان کے اکثر مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری رہتا تھا لیکن مینا کماری نے گھر پر کمال کے سامنے کبھی ذکر نہیں کیا تھا کہ کون، کب ان سے ملنے آیا۔ کمال کا شکوہ یہی تھا کہ مینا ان باتوں کو راز رکھتی تھیں جس سے کچھ اس قسم کا تاثر پیدا ہوتا تھا جیسے دال میں کچھ کالا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مینا خود تذکرہ کر دیا کرتیں کہ آج فلاں سے اس طرح ملاقات ہوئی تھی یا آج یہ واقعہ پیش آیا تھا، تو شاید وہ ان باتوں کو اہمیت نہ دیتے اور نظر انداز کر دیا کرتے۔

پھر ایک روز اس قسم کی باتوں سے کہیں زیادہ سنگین اور دل شکن قسم کی ایک حقیقت کمال امروہی کے علم میں آئی۔ اس روز مینا کماری بیرون شہر شوٹنگ کے لیے صبح جلدی گھر سے روانہ ہو گئی تھیں۔ شاید عجلت کی وجہ سے وہ اپنی ڈائری ساتھ لے جانا بھول گئی تھیں جسے وہ اپنے تکیے کے نیچے رکھتی تھیں۔ بستر ٹھیک کرتے وقت کمال کی نظر اس ڈائری پر پڑ گئی۔ مینا کماری کو جب سے لکھنا آیا تھا تب سے وہ ڈائری لکھ رہی تھیں۔ ان کی ڈائری درحقیقت کوئی ڈائری نہیں بلکہ ایک قسم کی ''اسکریپ بک'' ہوتی تھی۔ یعنی جس وقت بھی ان کا کچھ لکھنے کو جی چاہتا تھا، وہ اس میں لکھ لیتی تھیں، کہیں کوئی تحریر، شعر، غزل یا اقتباس پسند آتا تھا، وہ اس میں نقل کر لیتی تھیں۔

کمال امروہی نے اس روز تو ڈائری واپس تکیے کے نیچے ہی رکھ دی لیکن دوسرے روز اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکے۔ مینا کماری ابھی شہر سے باہر تھیں۔ کمال نے ڈائری پڑھنا شروع کر دی۔ انہوں نے وہ ساری باتیں تو کسی کو نہیں بتائیں جو انہوں نے اس ڈائری میں پڑھیں لیکن ایک قریبی دوست اور رازدار کو اتنا ضرور بتایا کہ ''اس ڈائری کے مندرجات پڑھ کر میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ پھر ایک جملہ پڑھ کر میرا دل خون ہو گیا۔ مینا نے ایک جگہ لکھا تھا ''درحقیقت مجھے کبھی بھی کمال امروہی سے محبت نہیں رہی۔''

مینا کماری کی واپسی پر کمال نے وہ ڈائری خود ان کے حوالے کرتے ہوئے کہا ''تم اپنی یہ چیز گھر بھول گئی تھیں۔''

مینا نے ڈائری لے کر دوبارہ تکیے کے نیچے رکھ دی اور کسی قسم کی تشویش یا پریشانی کا اظہار نہیں کیا۔ اس رات کمال امروہی نے اپنی نجی زندگی کے موضوع پر مینا سے کھل کر بات کرنے کی کوشش کی اور جاننا چاہا کہ آخر مینا کو ان سے کیا شکایت یا شکایات ہیں؟ لیکن مینا گویا اس موضوع پر بات کرنے کی خواہش مند نہیں تھیں۔ انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ وہ بہت تھکی ہوئی ہیں اور سونا چاہتی ہیں۔

دن گزرتے گئے، دونوں کے درمیان غلط فہمیاں، شکوے گلے اور تلخیاں بڑھتی گئیں۔ ان کی ازدواجی زندگی میں گندے پانی کی جھیل کا سا ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ کسی طرف سے بھی دل و دماغ کو شادمانی دینے والا کوئی جھونکا آتا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس دوران اپنے کیریئر کے سلسلے میں مینا کماری کی ترقی کا سفر جاری تھا۔ 1955ء میں ان کی ایک اور کامیاب فلم ''چراغ کہاں روشنی کہاں'' ریلیز ہوئی تھی جس میں راجندر کمار ان کے ہیرو تھے جو ان دنوں نئے نئے سامنے آئے تھے۔ مینا کماری کے ساتھ ہیرو آنے کی وجہ سے ان کے کیریئر کو سہارا مل گیا۔ مینا کماری نے ان کی بہت رہنمائی اور ہمت افزائی بھی کی۔ ایسی ہی سرپرستی مینا کماری نے ایک سال پہلے سنیل دت کی بھی کی تھی جب وہ فلم ''ایک ہی راستہ'' میں ہیرو کاسٹ ہوئے تھے۔

مینا کماری اب اتنی بڑی اور طاقتور اسٹار بن چکی تھیں کہ وہ دوسروں کو اسٹار بنا بھی سکتی تھیں اور اسٹار بننے سے روک بھی سکتی تھیں۔ تاہم وہ نئے ہیروز کی ہر ممکن مدد کرتی تھیں۔ راجندر کمار اور سنیل دت، دونوں کی انہوں نے بہت مدد کی۔ 1960ء میں مینا کماری کی تین فلمیں ریلیز ہوئیں جن میں سے دو ''دل اپنا اور پریت پرائی'' اور ''کوہ نور'' بے حد کامیاب رہیں۔ مینا کماری نے بہت کم کامیڈی فلموں میں کام کیا۔ ''کوہ نور'' ان میں سے ایک تھی جس میں دلیپ کمار ان کے ہیرو تھے۔ ''دل اپنا اور پریت پرائی'' گو کہ مینا کماری کے شوہر کمال امروہی کی اپنی پروڈکشن تھی اور اس کی ہدایتکاری کے فرائض انہوں نے کشور ساہو کو سونپے تھے لیکن ان کے خیال میں یہ فلم اتنی خراب بنی تھی کہ وہ سوچ رہے تھے، اسے ریلیز ہی نہ کریں... مگر جب بادل ناخواستہ انہوں نے اسے ریلیز کیا تو یہ سپرہٹ ہو گئی۔ فلمی دنیا اسی کا نام ہے۔ بعض اوقات بڑے بڑے تجربہ کار اور باصلاحیت لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہو جاتے ہیں۔

مینا کماری کی ازدواجی زندگی کی صورت حال بدستور بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں کسی بڑے تنازعے کا سبب بن جاتی تھیں۔ مثلاً مینا کماری کو باسی روٹی بہت زیادہ پسند تھی حالانکہ بعض لوگ اسے صحت کے لیے اچھا نہیں سمجھتے۔ کمال امروہی کو باسی روٹی پسند نہیں تھی اور ان کے گھر میں مینا کماری کو اکثر باسی روٹی میسر نہیں آتی تھی۔ اس سلسلے میں کمال امروہی کا کہنا تھا کہ یہ اس کا اپنا گھر ہے، اگر اسے باسی روٹی کا اتنا ہی شوق ہے تو صرف ملازمہ کو حکم دے دیا کرے، وہ اس کے لیے رکھ دیا کرے گی۔ مینا کماری اس سلسلے میں ملازمہ کو ہدایت کرنا تو بھول جاتی تھیں لیکن جب انہیں باسی روٹی کی طلب ہوتی تھی اور نہیں ملتی تھی تو وہ بہت زیادہ غصے کا اظہار کرتی تھیں۔

ایک روز مینا اور کمال دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے میز پر بیٹھے تو مینا کماری نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ''میں کتنی بدنصیب ہوں۔ صرف ایک باسی روٹی مانگتی ہوں، اس گھر میں مجھے وہ بھی نہیں ملتی۔''

اس طرح کی باتوں سے دونوں میاں بیوی کے درمیان خلیج بڑھتی رہی۔ اسی زمانے میں ایک شخص بڑی خاموشی سے فلموں میں مینا کماری کی کارکردگی کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ صاحب اداکار، فلمساز، ڈائریکٹر اور رائٹر، سبھی کچھ تھے اور ان کا نام تھا گرودت۔ انہوں نے بھی زندگی میں اچھا، برا، دونوں طرح کا وقت دیکھا تھا۔ نجی زندگی میں وہ ایک عیش پسند اور شاہ خرچ آدمی تھے لیکن فلموں کے معاملے میں انہیں جینیئس تسلیم کیا جاتا تھا۔ ان کی بنائی ہوئی فلموں میں زیادہ تر آرٹ فلموں کی جھلک ہوتی تھی اور انہوں نے اس وقت تک ان فلموں سے دولت نہیں کمائی تھی۔ اب وہ ایک ایسی فلم کی تیاریاں کر رہے تھے جس میں آرٹ فلم کی جھلک تو ہو لیکن وہ عوامی پسندیدگی اور آمدنی کے اعتبار سے بھی ایک کامیاب فلم ہو۔ ان کی اس فلم کا نام ''صاحب بی بی اور غلام'' تھا اور اس کے مرکزی کردار ''چھوٹی بہو'' کے لیے ان کی نظر انتخاب مینا کماری پر تھی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ انہوں نے اپنے دوست ابرار علوی کے ساتھ مل کر کافی حد تک فلم کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ''چھوٹی بہو'' کو چھوڑ کر باقی ساری کاسٹ فائنل ہو چکی تھی۔ گانے ریکارڈ ہو چکے تھے، پوسٹر چھپ چکے تھے۔

چھوٹی بہو کے لیے گرودت کو مینا کماری سے زیادہ کوئی اداکارہ موزوں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شاید آپ کو یہ جان کر حیرت ہو کہ عین ممکن تھا کہ مینا کماری اس فلم میں کاسٹ ہو ہی نہ پاتیں اور اس کی تاریخ بالکل مختلف ہوتی۔ گرودت نے جب فلم کے سلسلے میں مینا کماری کو پیغام بھیجا تو جواب معذرت کی صورت میں آیا۔ مینا کماری اتنی مصروف تھیں کہ ان کے لیے مزید کوئی فلم سائن کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔

ایک انڈین لڑکی لندن میں رہتی تھی۔ وہاں کچھ فلموں اور اسٹیج ڈراموں میں کام کر چکی تھی۔ گرودت نے ''چھوٹی بہو'' کے کردار کے لیے، ٹکٹ بھیج کر اسے لندن سے بلوایا لیکن جلد ہی گرودت اس سے اور وہ گرودت سے مایوس ہو گئی۔ وہ گرودت کو ''چھوٹی بہو'' کے کردار کے لیے ذرا بھی مناسب نہیں لگی لیکن اس کے نخرے انڈیا کی اس وقت کی تمام سپر اسٹارز سے زیادہ تھے۔ آخرکار گرودت نے مایوس ہو کر اس سے معذرت کر کے اسے واپس بھیج دیا اور فلم کی شوٹنگ شروع کر دی۔ بہت جلد انہوں نے تقریباً پوری فلم کی شوٹنگ مکمل کر لی۔ اس اعتبار سے اسے اپنے وقت کی انوکھی فلم کہا جا سکتا تھا کہ اس کے صرف وہ حصے شوٹ ہونے سے رہ گئے تھے جن میں مرکزی کردار، یعنی ''چھوٹی بہو'' کا ہونا ضروری تھا۔

ایک بار پھر مینا کماری سے رابطہ کیا گیا اور اس کردار کے لیے بات کی گئی۔ اس بار بات چیت کامیاب رہی۔ مینا کماری نے شوٹنگ کے لیے مسلسل 45 دن دینے کی ہامی بھر لی البتہ انہیں جس معاوضے کی پیشکش کی جا رہی تھی، انہوں نے اس میں 25 فیصد اضافے کا مطالبہ کیا۔ دو چار دوسری چھوٹی موٹی شرائط تھیں۔ گرودت نے بے چوں چرا تمام شرائط مان لیں اور مینا کماری نے جلد ہی شوٹنگ کے لیے جانا شروع کر دیا۔ کہتے ہیں ہر اداکار کو اپنی زندگی میں کسی ایسے کردار کی تلاش ضرور رہتی ہے جو اس کی حقیقی شخصیت سے قریب تر ہو۔ مینا کماری کو بھی ''صاحب بی بی اور غلام'' میں چھوٹی بہو کا جو کردار ملا، وہ اسی زمرے میں آتا ہے۔ بہت سے پرانے فلمی شائقین اور ناقدین کی نظر میں وہی کردار مینا کماری کی اصل پہچان ہے۔

اوپر والا ہی بہتر جانتا ہے کہ مینا کماری نے یہ کردار کیوں قبول کیا۔ اس وقت تک نہ تو انہیں اس قسم کی اداکاری کا کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی حقیقی زندگی میں ان کی اس کردار سے، اس وقت تک کوئی مماثلت پیدا ہوئی تھی۔ یہ ایک دلچسپ اور عجیب اتفاق ہے کہ انہوں نے فلم میں اس قسم کا کردار پہلے ادا کر لیا اور حقیقی زندگی میں ان کی اس کردار سے مماثلت بعد میں پیدا ہوئی۔ کوئی اور بڑی اداکارہ شاید اس رول کے لیے ہامی بھی نہ بھرتی۔ خود مینا کماری کو بھی اعتراف تھا کہ وہ پہلے دن اس فلم کی شوٹنگ کے لیے جاتے وقت اس طرح نروس تھیں جیسے انہوں نے اداکاری نئی نئی شروع کی ہو۔

(جاری ہے)

بیوی کی قسمت کا چاند جگمگایا
شوہر کے نصیب کا ستارہ ٹمٹمایا

قسط:12

اس فلم میں مینا کماری ہندوستان میں انگریز راج کے زوال کے زمانے میں، ایک رئیس اور جاگیر دار قسم کے بنگالی گھرانے کی ''چھوٹی بہو'' دکھائی گئی تھیں جو بڑی سی، شاندار حویلی میں رہتی ہے، قیمتی ساڑھیاں پہنتی ہے، سونے اور ہیروں کے زیورات سے لدی پھندی رہتی ہے، اسے دنیا کی ہر نعمت حاصل ہے، سوائے اپنے شوہر کی محبت، توجہ اور التفات کے۔ شراب نوشی، مجرے دیکھنا اور اپنی عیش و عشرت کی دنیا میں مگن رہنا اس کے شوہر کے مشاغل ہیں۔ وہ اپنے شوہر کا التفات حاصل کرنے کے لیے ہر حربہ آزماتی ہے مگر ناکام رہتی ہے۔ وہ اس کی طرف توجہ سے دیکھتا تک نہیں۔

ایک موقع پر شوہر گویا چڑ کر پوچھتا ہے ''کیا تم میرے لیے شراب پی سکتی ہو؟ ناچ سکتی ہو؟''

چھوٹی بہو اس کے لیے بھی تیار ہو جاتی ہے۔ بد نصیبی یہ تھی کہ یہ سب کچھ کر کے بھی اسے شوہر کی محبت اور توجہ حاصل نہ ہو سکی البتہ اسے شراب کی لت ضرور لگ گئی جس نے اسے ایک المناک انجام سے دوچار کیا۔ مینا کماری نے اس وقت تک شراب کے اثرات سے آگاہ نہ ہونے کے باوجود اس طرح یہ کردار کیا کہ بعض ناقدین تو اسے ہی ان کے فن کی انتہا قرار دیتے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر 32ء سال تھی اور وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھیں۔ یہ کردار قبول کر کے انہوں نے نہ صرف خود کو امتحان میں ڈالا تھا بلکہ اپنے کیریئر کے لئے خطرہ بھی مول لیا تھا۔

یاد رہے کہ وہ 1962ء کا زمانہ تھا جب فلم ریلیز ہوئی اور فلم میں 19ء ویں صدی کا دور دکھایا گیا تھا۔ بگھی میں سفر کے دوران مینا کماری اور گرودت پر، پس منظر میں ہیمنت کمار کی آواز میں گانے کے ساتھ ایک سین ایسا بھی پکچرائز ہوا جسے سنسر بورڈ نے فلم ریلیز ہونے کے بعد، دوسرے دن کاٹ دیا۔ گرودت نے نہایت عجلت کے عالم میں چند ٹکڑے دوبارہ پکچرائز کر کے وہاں جوڑے۔ یہ بھی گویا کاروباری اعتبار سے فلم کے لیے ایک جھٹکا تھا۔ ویسے بھی اس دور کے اعتبار سے یہ مروجہ ڈگر سے ہٹی ہوئی، ایک غیر روایتی قسم کی فلم تھی، اس وجہ سے گرودت نے کاروباری اعتبار سے اس کے ساتھ کچھ زیادہ امیدیں وابستہ نہیں کی تھیں۔ لیکن جب سنیما گھروں کے سامنے اس فلم کو دیکھنے کے لیے آنے والوں کی لمبی قطاریں نظر آئیں تو گرودت، مینا کماری اور دوسرے متعلقہ لوگوں کو خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی ہوئی۔

ایک طرف مینا کماری کو اس فلم پر مبارکبادیں مل رہی تھیں، دوسری طرف ان کی ازدواجی زندگی میں تلخیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ انہی دنوں سہراب مودی نے ایک فلم کے پریمیئر شو میں مینا کماری اور کمال امروہی کو مدعو کیا۔ مدعو کئے جانے والے زیادہ تر افراد کا تعلق معاشرے کے اونچے طبقات سے تھا۔ سہراب مودی نے مینا کماری کا تعارف مہاراشٹر کے گورنر سے کراتے ہوئے کہا ''یہ ہمارے ملک کی مشہور اداکارہ مینا کماری ہیں۔''

پھر انہوں نے کمال امروہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''اور یہ ان کے شوہر کمال امروہی ہیں۔''

اس سے پہلے کہ سلام، نمستے وغیرہ کا تبادلہ ہوتا، کمال امروہی بول اٹھے۔ انہوں نے گویا تصحیح کرتے ہوئے کہا ''نہیں... میں کمال امروہی ہوں اور یہ میری بیگم ہیں... مشہور اداکارہ مینا کماری۔''

یہ کہہ کر کمال امروہی، ایروز سنیما سے رخصت ہو گئے جہاں فلم کا پریمیئر شو دکھایا جانا تھا۔ مینا کماری نے وہ شو اکیلے بیٹھ کر دیکھا۔

''صاحب بی بی اور غلام'' کو بھارتی حکومت نے سرکاری طور پر برلن فلم فیسٹیول میں بھیجنے کے لیے منتخب کیا۔ مینا کماری کو اس فلم کے ساتھ مندوب کے طور پر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت تک مینا کماری ملک سے باہر کہیں نہیں گئی تھیں۔ تاہم انہیں تنہا نہیں بھیجا جا رہا تھا۔ اس وقت کے وزیر اطلاعات نے دونوں میاں بیوی کے لیے ٹکٹ بھجوائے لیکن کمال امروہی نے مینا کماری کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔

انہوں نے کہا ''میں کس حیثیت سے جاؤں؟ میں نہ اس فلم کا ڈائریکٹر ہوں اور نہ ہی رائٹر... میں خواہ مخواہ صرف مینا کماری کے شوہر کی حیثیت سے، دُم چھلّا بن کر نہیں جا سکتا۔''

تاہم کمال امروہی نے مینا کماری کو جانے سے منع نہیں کیا لیکن مینا کماری بھی بہر حال اس فیسٹیول میں نہیں گئیں۔

اس طرح کی باتیں دونوں میاں بیوی کے درمیان خلیج کو بڑھا رہی تھیں۔ مینا کماری کے خیال میں کمال امروہی غیر ضروری انا پرستی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ مینا کماری اس بات پر معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انہیں اس بات پر غصہ آتا تھا۔ کمال امروہی محسوس کرتے تھے کہ اب ان کی شناخت مشہور ادیب، فلم رائٹر اور ''محل'' جیسی مشہور فلم کے ڈائریکٹر کی نہیں، بلکہ صرف ''مینا کماری کے شوہر'' کی رہ گئی ہے اور ان کا کام صرف مینا کماری کی فلموں کے معاملات طے کرنا رہ گیا ہے۔ کمال امروہی کے اس احساس کو شدید تر بنانے میں شاید اس حقیقت نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا کہ جوں جوں مینا کماری کا کیریئر عروج کی طرف جا رہا تھا، کمال امروہی کے کیریئر پر زوال آ رہا تھا۔ اب ظاہر ہے، اس میں مینا کماری کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر اس حقیقت کی وجہ سے کمال امروہی لاشعوری طور پر کسی قسم کے احساس کمتری کا شکار ہو رہے تھے تو مینا کماری کو اس کے ردّ عمل کا نشانہ بنا کر وہ کسی حد تک زیادتی کر رہے تھے۔

مینا کماری نے اب ایک نئی مرسیڈیز خرید لی تھی لیکن کمال امروہی اس میں نہیں بیٹھتے تھے۔ انہوں نے مینا کماری سے کہا تھا ''جب تم اسٹوڈیو جاؤ تو اپنی مرسیڈیز میں جاؤ لیکن جب تمہیں میرے ساتھ کہیں جانا ہوا کرے گا تو تمہیں میری پرانی بیوک میں ہی جانا پڑے گا۔''

شاید کمال امروہی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ سات سال کی جس بچی سے وہ ایک کمرے کے غریبانہ سے گھر میں ملے تھے اور جسے انہوں نے اپنی فلم کے لئے چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر منتخب نہیں کیا تھا، وہ ایک روز نہ صرف ان کی بیوی ہو گی بلکہ شہرت و کامیابی کے راستے پر انہیں بہت پیچھے چھوڑ جائے گی۔ بیوی کی قسمت کے دمکتے چاند کے سامنے شوہر کی قسمت کا ستارہ محض ٹمٹماتا ہی رہ جائے گا۔

اس بات کا بالکل درست اندازہ لگانا تو مشکل ہے کہ مینا کماری کو شراب نوشی کی لت کب لگی، لیکن یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس کا آغاز ان کی بے خوابی کی وجہ سے ہوا۔ بے خوابی کی مریضہ تو وہ نوجوانی میں کمال امروہی سے عشق کے آغاز میں ہی ہو گئی تھیں کیونکہ ان دنوں وہ دونوں رات رات بھر فون پر بات کرتے تھے اور ستم یہ تھا کہ مینا کماری اپنی فلمی مصروفیات کی وجہ سے دن میں بھی نہیں سوتی تھیں۔ یوں ان کی سونے کی عادت ہی تقریباً ختم ہو گئی تھی لیکن ظاہر ہے، مستقل طور پر کسی انسان کا نیند سے اس حد تک محروم رہنا ایک خطرناک بات تھی۔ اتنا زیادہ جاگنے والوں کے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ اب وہ سونا بھی چاہتی تھیں تو نہیں سو پاتی تھیں۔

انہوں نے اپنے مستقل معالج، ڈاکٹر سعید تیمور زادہ سے اپنے اس مسئلے کے بارے میں تبادلہ خیال کیا تو انہوں نے اطمینان سے مینا کماری کو روزانہ رات کو تھوڑی سی مقدار میں برانڈی پینے کا مشورہ دے دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس سے مینا کے اعصاب کو سکون ملے گا اور کچھ عرصے بعد ان کے اعصاب اس قابل ہو جائیں گے کہ وہ برانڈی کے سہارے کے بغیر بھی سو سکیں گی... لیکن افسوس... کہ ایسا نہیں ہو سکا۔ اس وقت شاید ڈاکٹر اور مریض، دونوں میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ موت کے راستے پر یہ مینا کماری کا پہلا قدم ثابت ہو گا!

برانڈی کو مینا کماری کی زندگی میں داخل ہوئے کافی دن گزر گئے تو ایک روز کمال امروہی نے دیکھا کہ مینا کماری کی ملازمہ ایک گلاس میں جو برانڈی ڈال کر انہیں دے رہی تھی، اس کی مقدار کچھ زیادہ تھی۔ وہ کم و بیش آدھا گلاس تھا۔ اس سے پہلے انہوں نے اس معاملے پر توجہ نہیں دی تھی۔ اب انہوں نے دیکھا، تو ملازمہ کو ڈانٹا کہ وہ اتنی مقدار میں مینا کماری کو برانڈی نہ دیا کرے۔

بظاہر تو ان کی اس ہدایت پر عمل ہونے لگا لیکن مزید کچھ عرصہ گزرا تو ایک روز کمال امروہی پر انکشاف ہوا کہ میاں بیوی کے باتھ روم میں ڈیٹول کی جو بوتلیں رکھی ہوتی ہیں، ان میں در حقیقت ڈیٹول نہیں، بلکہ برانڈی ہوتی ہے جس کے بارے میں کمال کو قطعی علم نہیں تھا کہ وہ کب اور کتنی مقدار میں استعمال ہوتی ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ مینا کماری نہایت مضبوط اعصاب کی مالک تھیں جو برسوں سے بے خوابی کی مریض ہوتے ہوئے، انتھک انداز میں اتنا زیادہ کام کرتی رہیں اور نروس بریک ڈاؤن کا شکار نہیں ہوئیں لیکن جیسے ہی انہیں عارضی سکون دینے والا سہارا میسر آیا، وہ زیادہ ہی تیزی سے اس کی اسیر ہو گئیں۔

اس زمانے میں ان کی مصروفیت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے سولہ فلموں کے کنٹریکٹ سائن کیے ہوئے تھے۔ جب تک انہیں برانڈی کا سہارا میسر نہیں آیا تھا، ان دنوں ایک بار انہوں نے خود کہا تھا ''میں جب صبح شوٹنگ کے لیے روانہ ہوتی ہوں تو مجھ پر ایک عجیب سی تھکن طاری ہوتی ہے۔ میں اپنے آپ کو مضمحل محسوس کرتی ہوں۔ میں روز سوچتی ہوں کہ آج شوٹنگ سے واپس آؤں گی تو اپنا سامان پیک کر کے بہت ساری چھٹیاں منانے کے لیے کسی طرف نکل جاؤں گی۔''

ایک طرف اتنی مصروفیت تھی، دوسری طرف گھریلو زندگی میں اتنی ہی زیادہ تلخیاں تھیں۔ میاں بیوی کے درمیان ہاتھا پائی کی نوبت بھی آنے لگی تھی۔ ایک بار عین عید کے دن مینا کماری نے کمال امروہی سے تلخ کلامی اور گرما گرمی کے بعد ان کی نئی، قمیض کا گریبان چاک کر دیا۔ اس روز کمال امروہی نے بھی اپنے بیان کے مطابق، پہلی بار مینا کماری پر ہاتھ اٹھایا۔ بہر حال، ایک مشہور اداکارہ کی گھریلو زندگی خواہ کیسی بھی ہو لیکن فلم کی شوٹنگ کے لیے سیٹ پر وہ مسکراتے ہوئے پہنچتی ہے۔ عوام کے سامنے بھی وہ اسی طرح آتی ہے اور بڑی بڑی تقریبات میں بھی وہ ہنستا مسکراتا چہرہ لے کر پہنچتی ہے اور اخباروں، رسالوں میں بھی اس کے اسی ہنستے مسکراتے چہرے کی تصویریں چھپتی ہیں۔ اس کا وہ چہرہ جو گھریلو تلخیوں، اندر کے دُکھوں اور بے سکون زندگی کی وجہ سے کافی حد تک مسخ سا ہو جاتا ہے، وہ کہیں بھی کیمرے کے سامنے نہیں آتا۔ وہ چہرہ ہمیشہ گھر سے باہر کے لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ مینا کماری بعض تقریبات میں کمال امروہی کے ساتھ بھی، ان کا ہاتھ تھام کر، ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ شرکت کرتیں جبکہ گھر میں میاں بیوی کے درمیان بات چیت بند تھی۔

(جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات

وہ گلزار سے بہت متاثر ہو گئیں

زندگی میں دُکھ سکھ ساتھ چلتے ہیں، کسی ایک شعبے میں دکھ اور ناکامی ملتی ہے تو دوسرے میں خوشی اور کامیابی مل جاتی ہے۔ اس طرح حساب کتاب برابر رہتا ہے اور زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔ مینا کماری کو اگر گھریلو زندگی میں اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کے مطابق خوشیاں حاصل نہیں تھیں تو باہر کی زندگی میں، اپنے کام کے سلسلے میں انہیں بہر حال خوشیاں اور کامیابیاں نصیب ہو رہی تھیں۔ 5، اپریل 1963ء کو انہوں نے ایک ریکارڈ قائم کیا۔ ''فلم فیئر'' ایوارڈز کے سلسلے میں وہ اکیلی اپنی تین فلموں پر بہترین اداکارہ کے ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئیں۔ گویا بہترین اداکارہ کے طور پر ان کا مقابلہ کسی اور سے نہیں، خود اپنے آپ سے تھا۔ 1962ء میں ریلیز ہونے والی جن تین فلموں پر وہ نامزد ہوئی تھیں، ان کے نام تھے ''صاحب بی بی اور غلام''، ''آرتی'' اور ''میں چپ رہوں گی۔''

ایوارڈز کی تقریب ریگل سینما میں 13، جون 1963ء کو منعقد ہوئی۔ اس موقع پر انڈین نیوی کے بینڈ کی خدمات حاصل کی گئی تھیں جو مہمانوں کے استقبال کے لیے موسیقی کی دُھنیں بکھیر رہا تھا۔ صوبے کی اس وقت کی گورنر وجے لکشمی پنڈت اس تقریب کی مہمان خصوصی تھیں۔ اس روز بارش ہو رہی تھی، اس کے باوجود ریگل سینما کے باہر عوام وخواص کا ہجوم بھی تھا اور مہمانوں کی آمد بھی جاری تھی۔ مینا کماری جب وہاں پہنچیں تو وہ حسبِ روایت سفید ساڑھی میں تھیں۔ ان کا پرس اور جوتیاں بھی سفید تھیں۔ گلے میں سفید موتیوں کا ہار تھا۔ اس روپ میں وہ بلاشبہ سادگی اور وقار کا پیکر یا پھر ایک پری دکھائی دے رہی تھیں۔

بے شمار تالیوں کی گونج میں انہوں نے اپنی تینوں نامزد فلموں میں سے ''صاحب بی بی اور غلام'' پر بہترین اداکارہ کا ایوارڈ وجے لکشمی پنڈت کے ہاتھوں سے وصول کیا۔ تین سال کے عرصے میں یہ ان کا مسلسل، تیسرا ایوارڈ تھا۔ یہ بھی ایک ریکارڈ تھا۔ اپنی مختصر سی تقریر میں انہوں نے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا ''آج میں بے حد خوش ہوں۔'' اس کا مطلب تھا کہ اگر گھر میں انہیں خوشیاں میسر نہیں تھیں تو کم از کم باہر تو انہیں کوئی نہ کوئی خوشی حاصل ہو ہی جاتی تھی۔ تقریر کے بعد مینا کماری نے فیض احمد فیض کے اشعار خوبصورتی سے سنائے اور حاضرین سے خوب داد پائی۔

اُس زمانے میں مینا کماری ہدایت کار بمل رائے کی فلم ''بے نظیر'' میں کام کر رہی تھیں۔ اس کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور نغمہ نگار ایک ابھرتے ہوئے شاعر اور ادیب گلزار تھے جنہیں فلمی دنیا کی کشش اس طرف کھینچ لائی تھی اور وہ یہاں اپنی صلاحیتیں آزما رہے تھے۔ مینا کماری جنہیں خود بھی شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی اور جو اس میدان میں طبع آزمائی بھی کرتی رہتی تھیں، بہت کم وقت میں گلزار سے کافی متاثر ہو گئی تھیں۔ شوٹنگ کے دوران وقفہ آتا تو دونوں اکثر کسی الگ گوشے میں بیٹھے شعر و ادب کی باتیں کرتے پائے جاتے۔

شاید مینا کماری اپنی گھریلو زندگی کی تلخی اور تشنگی کا علاج گلزار کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لگتا یہی تھا کہ یہ جسمانی کشش سے زیادہ ذہنی ہم آہنگی کا معاملہ تھا۔ مینا کماری اور گلزار کی ملاقات اور بات چیت اگر کسی فلم کے سیٹ پر نہ ہوتی تو پھر کسی نہ کسی وقت دونوں کے درمیان فون پر ضرور رابطہ ہوتا۔ بہت عرصے بعد ایک بار کمال امروہی کسی سے گفتگو کے دوران یہ کہتے پائے گئے کہ ان کی گھریلو زندگی کو تباہ کرنے میں فلم ''بے نظیر'' نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ سننے میں آیا ہے کہ بمل رائے، ان کے گروپ کے دو تین دوسرے آدمی اور اداکار محمود، جو مینا کماری کے بہنوئی بھی تھے، یہ سب لوگ موقع ملنے پر مینا کماری کے کان بھی بھرتے تھے۔

بمل رائے کے ساتھ پیش آنے والا ایک واقعہ بھی شاید اس کی بنیاد بنا ہو۔ کچھ عرصہ پہلے بمل رائے اپنی فلم ''دیوداس'' کے لیے مینا کماری کو ہیروئن کے طور پر سائن کرنے کے لیے کمال امروہی کے پاس گئے تھے۔ کمال امروہی نے نہ جانے کیوں اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا اور بمل رائے کو صاف جواب دے دیا تھا کہ مینا کماری اس فلم میں کام نہیں کر سکتیں۔ یہ کردار بعد میں سچترا سین نے کیا اور فلم بے حد کامیاب رہی۔ ''بے نظیر'' کی شوٹنگ کے دوران ایک بار بمل رائے نے غالباً اپنی حیرت دور کرنے کے لیے مینا کماری سے پوچھا کہ انہوں نے اتنی عمدہ فلم میں اتنا شاندار کردار ادا کرنے سے انکار کیوں کیا؟

اس پر مینا کماری نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ انہیں تو معلوم ہی نہیں، کہ ان کے لیے اس قسم کی کوئی آفر آئی تھی۔ بہر حال... وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن سننے میں آیا ہے کہ بمل رائے اور محمود گروپ مینا کماری کے کان بھرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ وہ دوستوں اور ہمدردوں کی طرح مینا کماری کو سمجھاتے ''یہ شخص تمہیں استعمال کر رہا ہے۔ تم اس کے لئے پیسہ کمانے کی مشین ہو، اور کچھ نہیں۔ فلم انڈسٹری میں اس وقت تمہاری سب سے زیادہ ڈیمانڈ ہے اور تمہاری ساری آمدنی اس کے پاس جا رہی ہے۔ تمہارے پاس کیا ہے؟''
رفتہ رفتہ یہ باتیں مینا کماری کے دل و دماغ پر اثر کرنے لگیں۔

1963ء کے اختتام تک مینا کماری، کمال امروہی کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور کمال امروہی کو بھی اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا۔ ایک روز جب مینا کماری اسٹوڈیو جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں، کمال امروہی بیڈ روم میں آئے۔ انہوں نے مینا کماری کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر التجائیہ لہجے میں کہا ''منجو! مجھے چھوڑ کر مت جانا۔''

مینا کماری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خلیج شاید اب اتنی وسیع ہو چکی تھی کہ اسے پاٹا نہیں جا سکتا تھا۔ فروری 1964ء کے دوران مینا کماری نے رفتہ رفتہ اپنا سامان خاموشی اور رازداری سے اپنی ایک دوست اداکارہ کے گھر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ پھر 5، مارچ 1964ء کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے دونوں میاں بیوی کی علیحدگی میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس روز مینا کماری کی فلم ''پنجرے کے پنچھی'' کی مہورت، یعنی شوٹنگ کا آغاز ہونا تھا۔ عام طور پر فلم والے اپنی ہر فلم کا آغاز بڑے اہتمام سے کرتے ہیں۔ پہلا شاٹ لینے کا کام ایک تقریب کے سے انداز میں ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کی رسم سی بن گی ہے۔

کمال امروہی کے ہر کام میں پیش پیش رہنے والے باقر اپنی بیگم سمیت مہورت کے وقت، یعنی گیارہ بجے سے پہلے ہی اسٹوڈیو پہنچ گئے تھے تاکہ انتظامات کا جائزہ لے سکیں۔ مطمئن ہو کر انہوں نے ''ہیئر ڈریسر'' برتھا کو بلایا اور اسے سختی سے ہدایت کی کہ آج وہ کسی کو مینا کماری کے میک اَپ روم میں نہ جانے دے۔ ساڑھے گیارہ بجے تک مینا کماری وہاں نہیں پہنچیں۔ ان کے نہ آنے کی وجہ سے تقریب رُکی ہوئی تھی۔ ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے اِدھر اُدھر فون گھمائے گئے۔

آخر کار مزید آدھے گھنٹے کی تاخیر کے بعد مینا کماری آن پہنچیں لیکن ان کا موڈ سخت خراب دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنے میک اَپ روم کی طرف چل دیں۔ ہیئر ڈریسر برتھا راستے میں کھڑی تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہو لی۔ باقر نے برتھا کو جو ہدایت کی تھی کہ مینا کماری کے میک اَپ روم میں خود ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص نہ جائے، وہ ہدایت برتھا نے اپنے آپ تک محدود رکھنے کے بجائے مینا کماری کے گوش گزار کر دی۔ مینا کماری چلتے چلتے رک گئیں۔ ان کے چہرے پر غصے اور ناراضگی کے تاثرات مزید گہرے ہو گئے۔

انہوں نے فوراً گلزار کو بلا بھیجا جو قریب ہی کہیں موجود تھے۔ وہ چند سیکنڈ میں ہی آ گئے۔ مینا کماری نے انہیں اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میک اَپ روم اوپر کی منزل پر تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ میک اَپ روم کی سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ راستے میں مینا کماری کو باقر بھی نظر آ گئے۔ مینا کماری نے طنزیہ انداز میں انہیں ''آداب'' کہا۔ اب منظر یہ تھا کہ تینوں افراد ساتھ ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ چند سیڑھیوں کا یہ سفر کتنا ہنگامہ خیز ثابت ہونے والا تھا، اس کا اندازہ اس وقت تک کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ مختصر سا فاصلہ اس وقت نہایت فیصلہ کن بن گیا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں کم از کم دس افراد کے بیانات موجود ہیں جن کا کہنا ہے کہ وہ اس وقت وہاں موجود تھے اور اس واقعے کے چشم دید گواہ ہیں لیکن ان سب ''چشم دید'' گواہوں کے بیانات مختلف ہیں۔ اس لیے ہم صرف ان دو افراد کے بیانات تک محدود رہیں گے جو اس واقعے کے اہم ترین کردار ہیں یعنی مینا کماری اور باقر۔

میک اَپ روم کے سامنے پہنچ کر گلزار ہچکچاہٹ آمیز انداز میں رک گئے کیونکہ ان کے اور مینا کماری کے درمیان باقر حائل تھے۔ مینا کماری نے گلزار کی طرف دیکھا اور میک اَپ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''آئیے نا... آپ رُک کیوں گئے؟''

مینا کماری کے اس طرح، صاف طور پر دعوت دینے سے گویا گلزار کو حوصلہ ملا اور انہوں نے قدم آگے بڑھایا لیکن باقر نے انہیں روک دیا۔ گلزار قدرے شرمندگی کے سے عالم میں بیچ میں پھنس کر رہ گئے۔ انہیں یقیناً یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ صورت حال کوئی خراب رخ اختیار کرنے والی ہے۔

مینا کماری انتہائی غصے سے باقر پر چیخیں ''تم کون ہوتے ہو میرے مہمان کو روکنے والے؟ تم مجھے کیا سمجھتے ہو اور خود کو کیا سمجھتے ہو؟ تمہارے خیال میں کیا میں بد چلن عورت ہوں جو تم میرے میک اَپ روم میں لوگوں کے آنے پر پابندیاں لگاتے ہو؟''

غضبناک لہجے میں یہ سب کچھ کہتے ہوئے انہوں نے آگے بڑھ کر سب کے سامنے گلزار کو گلے لگا لیا۔ مینا کماری کا بیان ہے کہ یہ دیکھ کر باقر نے انہیں تھپڑ مارا جبکہ باقر نے بعد میں قسمیں کھا کر کہا کہ انہوں نے مینا کماری کو تھپڑ نہیں مارا، اُن کی اتنی جراٴت ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ مینا کماری کو تھپڑ مارتے۔ بہر حال، نرگس جو قریب ہی کہیں شوٹنگ کر رہی تھیں، انہوں نے ہنگامے اور چیخ و پکار کی آوازیں سنیں۔ انہوں نے باقر کو بھی چیختے سنا، جس کے بارے میں باقر کا کہنا تھا کہ وہ تو سب کو چپ کرانے اور معاملے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہیں کہیں شوٹنگ کرتے ہوئے بلراج ساہنی بھی موقع پر آن پہنچے تھے اور باقر نے صورت حال کو سنبھالنے میں ان سے بھی مدد مانگی تھی۔ مہورت کے لیے مدعو کیے گئے کچھ مہمان بھی شور شرابا سن کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ بہر حال، اس روز مہورت کی تقریب تو دھری کی دھری رہ گئی کیونکہ شعلہ جوالا مینا کماری، باقر سے یہ کہہ کر، پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئیں ''کمال صاحب سے کہہ دینا کہ میں آج گھر نہیں آؤں گی۔''

مینا کماری اپنی بات کی کچھ زیادہ ہی پکی نکلیں۔ وہ اس رات تو کیا، اس کے بعد بھی زندگی بھر کمال امروہی کے گھر واپس نہیں گئیں۔ اسٹوڈیو سے نکل کر وہ اپنے ایک جاننے والے، مسٹر رجنی پٹیل کے پاس پہنچیں۔ ان سے صلاح مشورے کے بعد طے پایا کہ فی الحال مینا کماری کو اپنی بہن مدھو کے گھر چلے جانا چاہیے، بعد میں ان کے لیے کسی مناسب قیام گاہ کا بندوبست کیا جائے گا۔ مسٹر رجنی پٹیل نے اپنے اسسٹنٹ کشور شرما کو ہدایت کر دی کہ وہ ان حالات میں مینا کماری کی مدد کرنے کے لیے ان کے ساتھ رہے۔ کشور شرما نے مدھو کو فون کیا اور محمود سے بھی بات کی، انہیں بتایا کہ مینا کماری عارضی طور پر ان کے ہاں رہنے آ رہی ہیں۔ محمود نے اس پر خوشی کا اظہار کیا لیکن مشورہ دیا کہ مینا کماری رات کو، ذرا دیر سے ان کے ہاں آئیں کیونکہ اس وقت ان کا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا جن کے سامنے مینا کماری کا وہاں قیام کی غرض سے آنا وہ مناسب نہیں سمجھ رہے تھے۔ کشور شرما کے خیال میں یہ تو اور بھی اچھی بات تھی کہ مینا کماری رات کے اندھیرے میں محمود کے ہاں جائیں۔

محمود کا گھر اندھیری کے علاقے میں تھا۔ وہاں جانے سے پہلے کسی خیال کے تحت مینا کماری نے اسٹوڈیو کے قریبی پولیس اسٹیشن میں چار سطروں کی درخواست بھی جمع کرا دی کہ ان کی جان کو خطرہ ہے، اس لیے انہیں پولیس کی جانب سے تحفظ فراہم کیا جائے۔

دوسری طرف باقر نے گھر پہنچ کر اپنے دوست اور باس کمال امروہی کو تفصیل سے بتایا کہ فلم ''پنجرے کے پنچھی'' کی مہورت کے موقع پر کیا ہوا تھا۔ انہوں نے کمال کو یہ بھی بتایا کہ مینا جاتے ہوئے کہہ گئی ہیں کہ اب وہ کمال صاحب کے گھر واپس نہیں آئیں گی۔ کمال امروہی یہ سب کچھ سن کر ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے۔ اُلٹا، وہ ساری بات سننے کے بعد ہنس دیئے اور بولے ''ارے، وہ کہیں نہیں جائے گی۔ شام کو گھر آ جائے گی اور پھر بات چیت سے ساری غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔''

(جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات

MEENA KUMARI

کہیں یہ رسوائی عمر بھر

میرا پیچھا نہ کرتی رہے

قسط:14

دن گزرا تو ثابت ہوا کہ یہ محض کمال امروہی کی خوش فہمی تھی۔ شام ڈھل گئی، رات ہو گئی لیکن مینا کماری گھر واپس نہیں آئیں۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تو کمال کو تشویش ہوئی اور وہ اپنے آپ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ لگانے میں وہ کہیں غلطی تو نہیں کر رہے تھے؟ مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ مینا کماری کو تلاش کرنے کے لیے نکلیں تو جائیں کہاں؟ انہوں نے کئی اسٹوڈیوز اور جاننے والوں کے گھروں پر فون کئے لیکن کہیں سے مینا کماری کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔ آخر کار باقر، ان کا بیٹا اور کمال امروہی، تین افراد مل کر ممبئی کی سڑکوں پر مینا کماری کو تلاش کرنے نکلے لیکن یہ ایسا ہی تھا جیسے بھوسے کے انبار میں کوئی شخص سوئی تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ دراصل کمال امروہی کو خیال آیا تھا کہ مینا کماری غصے میں کہیں اِدھر اُدھر، بے مقصد انداز میں گاڑی چلاتی نہ پھر رہی ہو۔

انہوں نے بہت سے علاقوں کی خاک چھانی لیکن انہیں کہیں مینا کماری کی گاڑی دکھائی نہ دی۔ آخر کار انہیں اداکار محمود کے گھر جانے کا خیال آیا جو مینا کماری کے بہنوئی بھی تھے۔ محمود کا گھر ”اندھیری“ کے علاقے میں تھا۔ وہ وہاں پہنچے تو انہیں گیٹ پر دو تین پولیس والے اس طرح کھڑے نظر آئے جیسے پہرہ دے رہے ہوں۔ انہیں یقین ہو گیا کہ مینا کماری اسی گھر میں موجود تھیں۔ کمال امروہی اندر جانے کے لیے گاڑی سے اترنے لگے تو باقر اور ان کے بیٹے نے بھی ان کے ساتھ چلنا چاہا لیکن کمال نے انہیں روک دیا اور کہا ”یہ مجھ اکیلے کا نجی مسئلہ ہے، اس سے میں اکیلے ہی نمٹوں گا۔“

وہ گیٹ پر پہنچے اور پولیس والوں سے پوچھنے لگے کہ وہ وہاں کس سلسلے میں کھڑے تھے؟ پولیس والے انہیں جواب دے ہی رہے تھے کہ اندر سے محمود نکل آئے۔ انہوں نے نہایت مہذبانہ انداز میں کمال امروہی سے خیر و عافیت دریافت کی۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد کمال نے پوچھا ”کیا منجو یہاں ہے؟“

محمود نے جواب میں سچ بولا۔ ”جی ہاں... اوپر کی منزل پر ہیں... کمرے میں آرام کر رہی ہیں۔“

کمال نے کہا ”میں اپنی بیوی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

محمود التجائیہ لہجے میں بولے ”آج آپ کا ان سے بات کرنا مناسب نہیں ہے، کسی اور دن کر لیجئے گا۔“

اس دوران محمود کی بیگم اور مینا کماری کی بہن مدھو بھی باہر آ گئیں۔ کمال نے ان سے بھی کہا ”منجو کو میرا پیغام دے دیں کہ میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

مدھو ان کا پیغام لے کر اوپر کی منزل پر چلی گئیں۔ دس منٹ بعد وہ مینا کماری کا جواب لے کر آئیں۔ مینا کماری کم از کم آج رات اپنے شوہر سے ملنا یا بات کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اس کے باوجود کمال امروہی اوپر چلے گئے۔ انہوں نے اس کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا جس میں ان کی بیگم موجود تھیں۔ ان کی دستک کا کوئی جواب نہ ملا۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے مقفل تھا یا اس کا بولٹ چڑھا ہوا تھا۔

تب کمال امروہی نے بہ آوازِ بلند کہا ”منجو! دیکھو... میرے اور تمہارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی، کوئی جھگڑا نہیں ہوا۔ تمہاری جو بھی بات ہوئی ہے، باقر سے ہوئی ہے۔ بہر حال، میں معذرت طلب کرتا ہوں اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ باقر ہمارے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ اس سے پہلے کہ معاملہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے، پریس میں اس کے چرچے ہوں، ہر طرف اس بات کے تذکرے ہوں اور ہماری رسوائی ہو، میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ گھر واپس چلو، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔“

اپنی اس مختصر سی تقریر کے بعد کمال امروہی نے چند لمحے انتظار کیا کہ شاید کوئی جواب آئے یا اندر سے دروازے کا بولٹ گرے... لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سکوت برقرار رہا۔ اس دوران محمود اوپر آئے اور مشورہ دینے کے انداز میں کمال امروہی سے کہنے لگے ”آوازیں پڑوسیوں تک جا رہی ہوں گی۔ انہیں بھی اندازہ ہو رہا ہو گا کہ میاں بیوی میں جھگڑا ہو رہا ہے۔ ابھی آپ بات ختم کریں۔ پھر کسی وقت کر لیجئے گا۔“

کمال پہلے سے بھی زیادہ بلند آواز میں برہمی سے بولے۔ ”آج صرف پڑوسی سن رہے ہیں۔ چند دن بعد ساری دنیا سنے گی۔“

مینا کماری جس کمرے میں موجود تھیں، اس میں فون بھی موجود تھا۔ کمال امروہی نے ایک دوسرے فون سے اس کمرے میں فون بھی کیا لیکن وہاں گھنٹی بجتی رہی، کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ تب کمال امروہی نے دوبارہ مینا کماری کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر بہ آوازِ بلند کہا ”منجو! آج کے بعد میں کبھی تمہیں لینے نہیں آؤں گا۔“

انہوں نے اپنے کہے پر عمل کر کے دکھایا۔

محمود کا مکان کافی بڑا تھا اور حفاظت کے لیے اس کے لان پر خوفناک قسم کے کتے پھرتے رہتے تھے۔ مینا کماری کو اس میں ایک کشادہ اور آرام دہ کمرا دے دیا گیا تھا۔ اس گھر میں محمود اور ان کی بیوی بچوں کے علاوہ 38 دوسرے افراد بھی رہتے تھے۔ وہ سب محمود کے عزیز، رشتے دار تھے۔ کشور شرما کا کہنا ہے کہ مینا کماری جس رات یہاں پہنچیں، ان کے پاس صرف پانچ سو روپے اور تن کے کپڑے تھے لیکن کمال امروہی کا کہنا ہے کہ منجو نے بعد میں نہ صرف اپنا زیادہ تر سامان منگوا لیا تھا بلکہ بینک سے اپنی ساری رقم بھی نکلوا لی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ کمال امروہی کے بیان کے مطابق مینا کماری نے کسی سے یہ بھی کہا تھا ”میں ایسا انتظام کروں گی کہ کمال اور اس کے بچے سڑکوں پر بھیک مانگتے پھریں گے۔“ یہ بات کمال نے خاصے دکھ بھرے لہجے میں اپنے ایک قریبی دوست کو بتائی تھی۔

کمال امروہی کا کہنا تھا کہ انہوں نے خود خط لکھ کر مینا کماری سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنا سارا سامان اور روپیہ پیسہ اپنی تحویل میں لے لیں۔ ان کے دعوے کے مطابق انہوں نے 25 اگست 1968ء کو مینا کماری کو خط لکھا تھا جس میں دیگر مندرجات کے علاوہ باقی مضمون کچھ یوں تھا:

”... یہ سوال دل میں ایک خلش کی طرح اب بھی موجود ہے کہ آخر تم گھر واپس کیوں نہیں آئیں؟ تمہارا جھگڑا باقر سے ہوا تھا، مجھ سے تو نہیں... اور باقر کو بھی تم اپنے والد یا بڑے بھائی کی طرح سمجھتی تھیں۔ یہ بات تم نے اس جھگڑے سے پہلے ایک جگہ لکھی بھی تھی۔ بہر حال... میرے دل کی خلش دھیرے دھیرے، وقت کے ساتھ، لمحوں کی دھول میں دب جائے گی، چھپ جائے گی۔ ایک بات البتہ تم سے کہنی تھی۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی جگہ باقی ہے تو میری یہ درخواست ضرور مان لینا، کہ میرے گھر میں تمہارا جو بھی قیمتی سامان، مجھے دیے ہوئے تحائف یا روپیہ پیسہ موجود ہو، وہ فوراً منگوا لو۔ کہیں یہ رسوائی عمر بھر میرا پیچھا نہ کرتی رہے کہ میں نے تن کے تین کپڑوں میں تمہیں گھر سے نکال دیا تھا۔“

مینا کماری اگر اپنے اکاؤنٹ سے رقم نہ نکلواتیں اور کمال کے گھر سے اپنی چیزیں نہ منگواتیں تب بھی انہیں روپے پیسے کی کوئی تنگی نہ ہوتی کیونکہ جلد ہی انہوں نے محمود اور ان کے رشتے داروں کے ساتھ ایک فلم سائن کر لی جس کا نام ”چندن کا پالنا“ تھا۔ اس کے علاوہ بھی انہیں تین فلمیں مل گئیں جن میں ”چتر لیکھا“ بھی شامل تھی جس کے بارے میں کچھ عرصہ قبل کمال امروہی نے انہیں منع کیا تھا کہ وہ یہ فلم سائن نہ کریں۔ بہر حال ان فلموں کے ایڈوانس کی صورت میں رقوم ان کے پاس آنے لگیں اور انہیں کوئی مالی پریشانی نہ رہی۔

انہی دنوں دھرمیندر نامی ایک نوجوان کا اسٹوڈیوز میں کہیں کہیں ذکر ہونے لگا تھا۔ یہ نوجوان فلمی دنیا میں کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے پنجاب سے آیا تھا۔ اس ضمن میں اس کا عزم جس قدر مضبوط تھا، اس کی وجہ سے وہ قصے کہانیوں کا کوئی کردار لگتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ہر ماہ ہزاروں نوجوان، ہیرو بننے کا خواب اپنی آنکھوں میں سجائے ممبئی پہنچتے تھے اور ان میں سے بعض کو تو کسی اسٹوڈیو کے اندر جانے کا بھی موقع نہیں ملتا تھا اور بعض، اسٹوڈیوز میں سالوں دھکے کھانے کے باوجود ایکسٹرا بھی نہیں بن پاتے تھے لیکن یہ نوجوان ان باتوں سے نا امید ہونے والا ہرگز نہیں تھا۔

اسٹوڈیوز کے چکر لگاتے لگاتے اس کے جوتے پھٹ گئے، جیب خالی ہو گئی، فاقوں کی نوبت آ گئی لیکن وہ ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اس کی جدوجہد جاری رہی اور یہ یقین بھی برقرار رہا کہ وہ ایک نہ ایک روز ضرور کامیاب ہو گا۔

اسے نہ تو ایکٹنگ کے بارے میں کچھ معلوم تھا اور نہ ہی اس کی شکل روایتی ہیرو والی تھی۔ اس پر ایک نظر ڈال کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خالص دیہاتی، پنجابی نوجوان ہے اور دیسی گھی کھا کر پلا بڑھا ہے۔ بہر حال اس کی جدوجہد رنگ لائی اور اسے فلموں میں کام کرنے کا موقع مل ہی گیا لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس کی پہلی ہی فلم فلاپ ہو گئی اور دوسری میں بھی وہ کوئی خاص اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ نہ کر سکا۔ تاہم ”شعلہ اور شبنم“ کے نام سے بننے والی یہ فلم معمولی حد تک کامیاب رہی، نقادوں نے بھی اس کی معمولی سی تعریف کر دی اور اس نوجوان کو اس کا سب بڑا فائدہ یہ ہوا کہ وہ پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کی نظر میں آ گیا۔

پھر قسمت اس پر یوں مہربان ہوئی کہ ”پورنیما“ کے نام سے بننے والی ایک فلم میں وہ مینا کماری کے مقابل کاسٹ ہو گیا اور اس دن سے اس کی زندگی نے گویا ایک نیا موڑ لے لیا۔ دھرمیندر کو مینا کماری کے سامنے کام کرنے کے تصور سے گھبراہٹ ہو رہی تھی اور وہ اِدھر اُدھر، لوگوں سے معلومات حاصل کرتے پھر رہے تھے کہ وہ کس مزاج کی خاتون ہیں؟ انہیں معلوم تھا کہ وہ مینا کماری کے سامنے اداکاری تو ڈھنگ سے نہیں کر پائیں گے لیکن کم از کم یہ کوشش تو کر سکتے ہیں کہ ان کے مزاج کے خلاف کوئی حرکت کر کے انہیں زیادہ غصہ دلانے کا سبب نہ بنیں۔

اوپر سے لوگ بھی انہیں پہلے ہی ڈرا رہے تھے کہ مینا کماری کے سامنے اداکاری کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ایک صاحب نے تو مشورہ دیا کہ شاٹ دینے سے پہلے وہ مینا کماری کے پاؤں ضرور چھوئیں۔ حقیقت یہ تھی کہ مینا کماری نئے اداکاروں کی حوصلہ شکنی ہرگز نہیں کرتی تھیں۔ وہ تو صرف اپنے کام سے غرض رکھتی تھیں اور اپنی ہی دنیا میں مگن رہتی تھیں۔ اپنے خیالوں میں کھوئی رہتی تھیں۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ دھرمیندر پہلے ہی سے مینا کماری کے زبردست مداح تھے اور انہیں اس دور کی سب سے بڑی اداکارہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ انہیں اپنے ابتدائی دور میں ہی مینا کماری کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔

پہلی بار ان کا آمنا سامنا آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران ہوا۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اس موقعے پر دھرمیندر کافی نروس تھے لیکن مینا کماری ان کے ساتھ اتنی اچھی طرح پیش آئیں کہ ان کی گھبراہٹ دور ہو گئی۔ اس کے بعد تو مینا کماری نے گویا دھرمیندر کو اپنی ”سرپرستی“ میں لے لیا۔ مینا کماری ویسے بھی نئے آنے والوں سے شفقت اور مہربانی سے پیش آتی تھیں۔ ان دنوں وہ غالباً احساسِ تنہائی کا بھی شکار تھیں۔ دھرمیندر کی صورت میں انہیں ایک مضبوط سہارا نظر آیا۔

انہوں نے ابتدا ہی میں دھرمیندر کے بارے میں پیش گوئی کر دی تھی ”یہ کوئی عام نوجوان نہیں ہے۔ یہ ہماری فلم انڈسٹری میں ایک بہت اہم اور غیر معمولی اضافہ ہے۔ آپ دیکھئے گا، یہ بڑا نام پیدا کرے گا۔“

دھرمیندر اور مینا کماری جلد ہی ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ شوٹنگ کے دوران جب بھی انہیں وقفہ میسر آتا، وہ کسی کونے کھدرے میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے نظر آتے۔ مینا کماری، دھرمیندر کو اداکاری، مکالموں کی ادائیگی اور کیمرے کے سامنے حرکات و سکنات کے سلسلے میں ان کی خامیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کرتیں اور خود پرفارم کر کے بتاتیں کہ کوئی سین صحیح طریقے سے کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنے والوں کو بھی اندازہ ہونے لگا تھا کہ یہ معاملہ محض رہنمائی کا نہیں تھا۔ دھرمیندر اور مینا کماری کے درمیان ایک خاص تعلق استوار ہونے لگا تھا لیکن فلم انڈسٹری میں چونکہ مینا کماری کا اپنا ایک مقام تھا، اس لیے انہوں نے اس تعلق پر ایک قسم کا پردہ ڈالنے کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہوا تھا کہ ایک سینئر اداکارہ کے طور پر وہ ایک جونیئر اداکار کی مدد اور رہنمائی کر رہی تھیں۔

اس دوران اپنے بہنوئی محمود کے گھر پہ رہتے ہوئے مینا کماری کو احساس ہونے لگا تھا کہ ان کا وہاں پناہ گزیں ہونے کا فیصلہ درست نہیں تھا۔ وہ گویا ایک پنجرے سے نکل کر دوسرے پنجرے میں آ گئی تھیں۔ اس گھر میں رہنے والوں نے مینا کماری پر پوری طرح نظر رکھنا گویا اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ وہ دیکھتے کہ کون مینا کماری سے ملنے آ رہا ہے، وہ خود کہاں جا رہی ہیں، کہاں سے آ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ وہ ان کی ڈاک بھی چیک کرنے لگے۔ ان کے لیے کوئی فون آتا تو وہ پوری طرح ”تفتیش“ کرتے کہ کون فون کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ کوئی ان سے ملنے آتا تو اسے باہر سے باہر ٹرخا دیا جاتا اور مینا کماری کو اطلاع بھی نہ دی جاتی۔

ایشیا کے معروف مصنف کرشن چندر کی اہلیہ سلمیٰ صدیقی نے ایک بار مینا کماری کو فون کیا تو ان سے بھی اسی طرح جرح کی گئی اور خود ان کی اپنی ذات کے بارے میں بہت سے سوالات کئے گئے۔ اس ساری جرح بازی کے بعد بھی مینا کماری سے ان کی بات نہیں کرائی گئی اور کوئی تسلی بخش جواب بھی نہیں دیا گیا۔ ظاہر ہے، سلمیٰ صدیقی کو یہ بات بہت بری لگی۔ انہیں مینا کماری کے بارے میں کچھ تشویش بھی ہوئی۔ انہوں نے اپنے شوہر کرشن چندر سے کہا کہ انہیں مینا کماری کے گھر اطلاع دیئے بغیر ان سے ملنے جانا چاہیے۔ کرشن چندر نے پہلے تو کچھ ہچکچاہٹ ظاہر کی لیکن پھر بیوی کے اصرار پر ان کے ساتھ چلے گئے۔ (جاری ہے)

دھمیندر کی رفاقت اُن کے لئے
سب سے بڑی خوشی تھی

محمود کے گھر کے گیٹ پر بھی کرشن چندر اور ان کی اہلیہ سے خوب پوچھ گچھ ہوئی۔ صرف یہی نہیں، پوچھ گچھ کے دوران گھر کے اندر سے دو تین جسیم قسم کے کتے بھی بھونکتے ہوئے نکل آئے جنہیں دیکھ کر بے چارے کرشن چندر اور ان کی بیگم سلمیٰ صدیقی خوفزدہ ہو گئے۔ غنیمت یہ رہا کہ اس دوران یہ آوازیں مینا کماری نے سن لیں۔ وہ خود باہر آ گئیں اور اپنے مہمانوں کو اندر لے گئیں۔ حالات سے واقف کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ محمود کی مرضی سے نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی انہیں ان باتوں کا علم تھا۔ ان کے گھر میں رہنے والے بعض دوسرے افراد ان سے بالا بالا ہی یہ ہوشیاری دکھا رہے تھے۔

ظاہر ہے، مینا کماری یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے کشور شرما کو ہدایت کی کہ وہ ان کے لیے کوئی مکان تلاش کرے۔ کشور شرما نے ان کے لیے جوہو کے علاقے ''جانکی کٹیر'' میں ایک مکان تلاش کر لیا۔ 1964ء میں جوہو کا یہ علاقہ ڈزنی لینڈ کا کوئی حصہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ خاصے معقول قسم کے ولاز پر مشتمل تھا جن کے لان کافی بڑے تھے۔ گلیاں کچی تھیں۔ کشور شرما نے مینا کماری کے لیے جو وِلا تلاش کیا تھا، مینا نے اسے کرائے پر لے لیا اور محمود کے گھر میں اپنے قیام کے پانچ ماہ مکمل ہونے کے بعد اس ولا میں منتقل ہو گئیں۔ ولا کا کرایہ اس زمانے کے لحاظ سے کافی زیادہ تھا۔

یہاں بھی مینا کماری کے ساتھ قیام کرنے والوں کی تعداد کچھ کم نہ رہی۔ ان کی سوتیلی بہن، ان کے بچے اور کئی دوسرے عزیز، رشتے دار ان کے ساتھ رہنے کے لیے چلے آئے۔ مینا کماری نے کسی کو بھی منع نہیں کیا۔ ان سب کا دعویٰ تھا کہ وہ مینا کماری کی دیکھ بھال اور ان کی خدمت کے لیے ان کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔

کمال امروہی صرف ایک مرتبہ اس گھر میں گئے۔ انہوں نے بعد میں اپنے ایک قریبی شناسا کو بتایا ''اس گھر میں جا کر مجھے ایسا لگا جیسے میں چڑیا گھر میں آ گیا ہوں۔ کھڑکیوں کے شیشوں، پردوں کے پیچھے اور نہ جانے کہاں کہاں سے کوئی نہ کوئی جھانک کر مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہر طرف آنکھوں ہی آنکھوں کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت گھر میں کم از کم 25 افراد تو موجود تھے جو منجو کے ساتھ رہ رہے تھے۔''

دلچسپ بات یہ تھی کہ مینا کماری کی بہن مدھو بھی اپنے شوہر محمود کا گھر چھوڑ کر مینا کے ساتھ رہنے لگی تھی اور مسٹر کشور شرما بھی انہی کے ساتھ پائے جانے لگے تھے۔ مینا کماری جن دنوں محمود کے گھر میں رہ رہی تھیں، مدھو کے اپنے شوہر کے ساتھ شدید اختلافات شروع ہو چکے تھے۔ اب مینا کماری نے گھر لیا تو مدھو بھی شوہر کو چھوڑ کر ان کے پاس آ گئیں اور مدھو کی وجہ سے مسٹر کشور شرما نے بھی تقریباً یہیں ڈیرے ڈال لیے۔ کشور شرما اپنے بارے میں لوگوں کو اکثر بتاتے تھے ''میں شراب نہیں پیتا، گوشت نہیں کھاتا، میں نجومی، دست شناس اور فلسفی ہوں۔''

مدھو ان سے اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ اس نے آخر کار ان سے شادی کر لی۔ وہ دونوں مینا کماری کے گھر میں رہتے جہاں انہیں ایک الگ کچن بھی مل گیا تھا۔ کشور شرما نے مینا کماری کے وہ سارے کام سنبھال لیے تھے جو پہلے باقر اور کمال امروہی کرتے تھے۔ فلموں کے کنٹریکٹ سائن کرنا، معاوضہ طے کرنا اور وصول کرنا، ڈیٹس دینا، اس طرح کی تمام ذمے داریاں انہوں نے از خود سنبھال لی تھیں۔ مینا کماری کے گھر اور ان کی زندگی میں کشور شرما کا کردار بے حد اہم ہو گیا تھا۔

مینا کماری نے اپنے اس وِلا میں پانچ سال گزارے۔ ان کی زندگی کا یہ عرصہ اس اعتبار سے اہم تھا کہ اسی دوران دھیرے دھیرے ان پر زوال آیا۔ برانڈی پینے کی، ان کی وہ عادت جو ایک دو گھونٹ سے شروع ہوئی تھی، یہاں آنے کے بعد تیزی سے بڑھتی گئی۔ جلد ہی یہ عالم ہو گیا کہ دن میں ایک بوتل ختم کر لینا ان کے لیے کوئی خاص بات نہ رہی۔ زیادہ تر وہ تنہائی میں پیتی تھیں اور خالص پیتی تھیں۔ اس میں برف یا پانی، کچھ نہیں ملاتی تھیں۔ دھرمیندر تقریباً روزانہ ان کے ہاں آتے تھے اور وہ اکثر ان کی اس نشست کے ساتھی بن جاتے تھے جب بوتل ان کی رفیق ہوتی تھی۔

مینا کماری، دھرمیندر کو ''دھرم'' کہہ کر پکارتی تھیں اور رفتہ رفتہ وہ اپنے قریبی لوگوں میں اسی مختصر نام یا عرفیت سے پکارے جانے لگے تھے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ پینے کے معاملے میں دھرمیندر نے مینا کماری کی حوصلہ افزائی کر کے رفتہ رفتہ انہیں بے لگام بنا دیا... لیکن یہ درست نہیں ہے۔ دھرمیندر تو در حقیقت انہیں ایک مقررہ حد کے اندر رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی موجودگی میں مینا کماری اس حد کی پابندی کر بھی لیتی تھیں لیکن ان کے جانے کے بعد وہ ساری حدود وغیرہ بھول جاتی تھیں۔

اس دوران کام بہرحال جاری تھا۔ 1964ء میں بمل رائے کی ''بے نظیر'' اور کیدار شرما کی ''چتر لیکھا'' ریلیز ہوئیں جن میں مینا کماری ہیروئن تھیں۔ ان کی دوسری فلموں میں 'غزل'، 'میں لڑکی ہوں'، 'سانجھ اور سویرا' شامل تھیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب کی سب فلاپ تھیں۔ مینا کماری کو ان کا صرف یہ فائدہ ہوا کہ وہ مصروف نظر آتی رہیں۔ اسی سال کے دوران انہیں پانچ فلمیں اور ملیں جن میں سے چار میں ان کے ساتھ دھرمیندر تھے۔ یہ فلمیں ''پورنیما''، ''چندن کا پالنا''، ''پھول اور پتھر'' اور ''کاجل'' تھیں۔ اس زمانے میں مینا کماری کے لیے سب سے زیادہ خوشی کے لمحات وہ ہوتے تھے جو دھرمیندر کے ساتھ گزرتے تھے، خواہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ میں گزرتے یا کہیں اور نشست جمتی۔

مینا کماری کی ایک خوبی... یا پھر شاید خامی یہ تھی کہ وہ جب کسی سے پیار کرتی تھیں تو ڈنکے کی چوٹ پر کرتی تھیں۔ ان کے دور کی دوسری کئی ہیروئنوں کے بھی معاشقے چلتے تھے لیکن وہ انہیں خفیہ رکھنے میں کامیاب رہتی تھیں۔ تاریک چشموں اور برقعے کے نقابوں میں چہرہ چھپا کر، کسی ہوٹل کے کمرے میں یا پھر کسی اور خفیہ ٹھکانے پر اپنے چاہنے والوں سے ملتی تھیں۔ فلمی صحافی ہر مشہور فلمی شخصیت کی ٹوہ میں رہتے تھے لیکن زیادہ تر ایسی شخصیتیں اپنے راز کو راز رکھنے میں کامیاب رہتی تھیں۔ تاہم مینا کماری کو گویا ان باتوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ عورت ہوتے ہوئے بھی ''مردانہ وار'' عشق کرتی تھیں۔ دھرمیندر سے ان کے عشق کے بارے میں ہر کوئی جانتا تھا۔ شاید یہ بھی اس بات کی نشانی تھی کہ مینا کماری منافق نہیں تھیں۔

وہ پارٹیوں میں، پریمیئر شو کے موقع پر یا دوسری جگہوں پر اس حقیقت کو چھپانے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کرتی تھیں کہ دھرمیندر کے لیے ان کے دل میں کس قسم کے جذبات ہیں۔ کسی محفل میں وہ سب کے سامنے محبت سے دھرمیندر کا ہاتھ تھام لیتیں۔ اس چھوٹی سی بات کے خوب افسانے بنتے۔ اخباروں، رسالوں والے نمک مرچ لگا کر خبریں چھاپتے۔ ایک بار، جب شاید تخلیے میں دھرمیندر سے ان کی ملاقات کو کچھ زیادہ دن گزر گئے تھے، انہوں نے ایک محفل میں معنی خیز انداز میں دھرمیندر کی طرف دیکھتے ہوئے غالب کا یہ شعر پڑھا:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

عجیب بات یہ تھی کہ حقیقی زندگی کی یہ محبت، فلم کے پردے پر کوئی جادو نہیں جگا رہی تھی۔ ان کی فلم ''پورنیما'' بالکل ناکام رہی۔ ''کاجل'' کافی حد تک کامیاب رہی اور پیشگوئی کی جا رہی تھی کہ اس میں مینا کماری اپنی پرفارمنس پر ایک اور فلم فیئر ایوارڈ بھی جیت لیں گی لیکن اس میں دھرمیندر ان کے مقابل ہیرو نہیں تھے۔ وہ ثانوی کردار میں تھے۔ ہیرو راجکمار تھے۔ 1966ء میں جا کر، او۔ پی رالن کی فلم ''پھول اور پتھر'' میں مینا کماری اور دھرمیندر کو ایک جوڑی کے طور پر کامیابی نصیب ہوئی۔ فلم میں وہ تمام مسالے بھی موجود تھے جو عام طور پر کسی فلم کو کامیاب بناتے ہیں۔

مینا کماری نے غالباً کبھی نہیں سوچا تھا کہ دھرمیندر کے ساتھ ان کی محبت کب تک چلے گی اور اس کا انجام کیا ہو گا؟ وہ شاید اس فلسفے کی قائل تھیں کہ محبت کے جتنے بھی لمحے میسر آئیں، انہی میں مگن رہو، زیادہ آگے کی مت سوچو، یہ اندازے لگانے کی کوشش نہ کرو کہ اس محبت کا مستقبل کیا ہو گا۔ شاید وہ اس نظریے پر یقین رکھتی ہوں کہ مستقبل پر انسان کا کوئی اختیار نہیں۔ اگر وہ کبھی اپنی اور دھرمیندر کی محبت کے سلسلے میں مستقبل کے امکانات پر غور کرنے پر مائل بھی ہو جاتیں تو یقیناً انہیں اپنے راستے میں بہت سی دشواریاں حائل نظر آتیں۔

دھرمیندر شادی شدہ اور ایک بچے کے باپ تھے۔ ان کی بیوی ایک روایتی قسم کی پنجابی، گھریلو خاتون تھیں۔ اپنی گھریلو زندگی کے بارے میں دھرمیندر خود بھی ایک روایتی قسم کے آدمی تھے۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کو شاید کسی بھی قیمت پر، چھوڑنے پر تیار نہ ہوتے۔ دوسری طرف مینا کماری بھی قانونی طور پر ابھی تک کمال امروہی کی بیوی تھیں اور طلاق لینے کے سلسلے میں ان کی سوچ شاید ابھی کسی فیصلہ کن مرحلے تک نہیں پہنچی تھی۔ چنانچہ مینا کماری اور دھرمیندر، دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ایک دائرے میں مقید تھے۔

7 مئی 1966ء کو 13 ویں فلم فیئر ایوارڈ کی تقریب نہایت شان و شوکت اور اہتمام سے منعقد ہوئی جس میں مینا کماری نے حسب روایت سفید ساڑھی اور سفید جوتے پہن کر شرکت کی۔ ہولی وڈ کے کامیڈین ٹونی رینڈل اس تقریب کی کمپیئرنگ کر رہے تھے جنہوں نے اپنے چٹکلوں سے حاضرین کو خوب ہنسایا۔ مینا کماری کو فلم ''کاجل'' پر بہترین اداکارہ کا ایوارڈ دینے کے لیے ٹونی رینڈل نے انہیں ''لیڈی اِن وائٹ'' کے خطاب کے ساتھ اسٹیج پر بلایا۔ مسلسل تین فلم فیئر ایوارڈز اور کچھ وقفے کے بعد چوتھا ایوارڈ حاصل کر کے مینا کماری نے ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔ ایک روایت البتہ ٹوٹ گئی۔ اس بار ایوارڈ کی تقریب میں ان کے چندن (کمال امروہی) ان کے ساتھ نہیں تھے۔ تقریب کے دوران وہ سنیل دت اور دلیپ کمار کے قریب بیٹھی تھیں۔

چوتھا فلم فیئر ایوارڈ حاصل کرنے کے بعد مینا کماری نے اداکاری کے میدان میں گویا اپنے آپ کو ناقابل شکست ثابت کر دیا تھا لیکن شراب سے وہ شکست کھا چکی تھیں۔ ان کی شراب نوشی بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تو وہ ایک دن میں دو بوتلیں بھی ختم کر ڈالتی تھیں اور کبھی کبھی تو اس سے بھی آگے بڑھ جاتی تھیں۔ بڑے بڑے ''پکڑ'' بھی اب شاید اس معاملے میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اب بات برانڈی تک بھی نہیں رہی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ جو کوئی بھی انہیں یہ تباہی کا سامان فراہم کرنے پر مامور تھا، وہ کچھ بھی اٹھا کر لا دیتا تھا۔ حتیٰ کہ انہیں ٹھرّا بھی دے دیا جاتا تھا اور وہ کوئی اعتراض کیے بغیر اسے بھی حلق سے اتار لیتی تھیں۔ انہیں گویا اس بات سے کوئی غرض ہی نہیں رہی تھی کہ وہ کیا پی رہی ہیں۔ غالب کے الفاظ میں ان کا معاملہ گویا یوں ہو گیا تھا:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو

اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

یہ بلا نوشی آخر رنگ لائی اور مینا کماری کو جگر کی خرابی کا عارضہ لاحق ہو گیا۔ زیادہ مے نوشی کے باعث جگر خراب ہونے کی وجہ سے بولی وڈ کی بہت سی شخصیات جوانی میں ہی موت کے منہ میں جا چکی ہیں جن میں سے مینا کماری کے دور کے لوگوں میں سے اداکارہ و گلوکارہ گیتا دت، نغمہ نگار شیلندر، گلوکار سہگل اور موسیقار جے کشن کے نام قابل ذکر ہیں۔ حیرت انگیز امر یہ ہے کہ مینا کماری کی مے نوشی صرف تین سال، یعنی 1965ء سے 1968ء تک جاری رہی لیکن اس عرصے میں ہی ان کا جگر ناکارہ ہو گیا۔ شاید اس کی وجہ صرف شراب کی مقدار ہی نہیں بلکہ معیار بھی تھا۔ شاید ان کی مے نوشی کے دور میں زیادہ عرصے انہیں پتا ہی نہیں چل سکا کہ انہیں کیا پلایا جا رہا تھا یا پھر شاید انہیں پروا ہی نہیں رہی تھی۔

بہرحال انہیں یہ احساس تو تھا کہ یہ لت انہیں بری طرح لگ چکی ہے۔ ایک بار انہوں نے ''صاحب بی بی اور غلام'' کے ڈائریکٹر ابرار علوی سے کہا ''ایسا لگتا ہے میں سچ مچ تمہاری فلم کا کردار 'چھوٹی بہو' بن چکی ہوں۔'' یہ کہتے وقت ان کے لہجے میں کوئی تاسف بھی نہیں تھا۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اکثر مدہوش رہنے کے باوجود فلموں میں مینا کماری کا کام جاری تھا اور ان کی اداکاری کے معیار میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کشور شرما جو اس دوران مدھو سے شادی کر کے ان کے بہنوئی بن چکے تھے اور ان کے فلمی کیریئر کے سلسلے میں تمام ذمہ داریاں سنبھال چکے تھے، بتاتے ہیں ''دن کے گیارہ بجے تک وہ ایک بوتل ختم کر چکی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی تو عالم یہ ہوتا کہ میں باقاعدہ بازوؤں پر اٹھا کر انہیں گاڑی میں ڈالتا اور اسٹوڈیو روانہ ہو جاتا۔ جوں جوں اسٹوڈیو قریب آتا جاتا، ان کے حواس بحال ہوتے جاتے۔ اسٹوڈیو کے گیٹ تک پہنچ کر وہ بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آتیں اور جب وہ کیمرے کے سامنے پہنچ کر کام شروع کرتیں تو کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ گھر سے چلتے وقت اس خاتون کی کیا حالت تھی اور نہ ہی کسی کو یہ گماں گزر سکتا تھا کہ صبح بیدار ہونے کے بعد سے گیارہ بجے تک وہ ایک بوتل معدے میں اُتار چکی ہیں۔''

(جاری ہے)

اُن کا نیا دوست

ایک پُراسرار نوجوان تھا

1966ء کے اختتام تک دھرمیندر ایک بڑے اسٹار بن چکے تھے اور مینا کماری کی زندگی کے منظر نامے سے غائب ہو چکے تھے۔ ان کی جگہ ایک نیا نوجوان منظر نامے پر نمودار ہو چکا تھا۔ اس کا نام راہول تھا۔ وہ ایک عجیب پُراسرار سا کردار تھا۔ کہنے کو تو وہ ایک اداکار تھا لیکن کسی کو اس کی اداکارانہ صلاحیتوں یا اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ مون سون کے موسم کی طرح آیا اور چلا گیا۔ اس نے اپنے پیچھے اپنا کوئی خاص نشان نہیں چھوڑا۔ مینا کماری کے ساتھ اس کی صرف ایک ہی تصویر بعض لوگوں نے دیکھی ہے جس میں وہ خاصا معصوم صورت سا نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ ان دونوں کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، یہ بھی کوئی یقین سے نہیں بتا سکتا تھا۔

جب یہ نوجوان مینا کماری کے ساتھ نظر آنا شروع ہوا تو کچھ ایسی خبریں سننے میں آئی تھیں کہ وہ دونوں مل کر کوئی فلم بنا رہے تھے لیکن وہ فلم مکمل ہونا تو در کنار، کسی نے کبھی اس کی کوئی شوٹنگ بھی ہوتے نہیں دیکھی۔ ویسے یہ نوجوان صورت سے جتنا معصوم نظر آتا تھا، شاید حقیقت میں اتنا معصوم نہ رہا ہو۔ وہ لوگوں کو بتاتا تھا کہ مینا کماری سے اس کی باقاعدہ شادی تو نہیں ہوئی لیکن انہیں بس میاں بیوی ہی سمجھا جائے۔ اس نے تو یہ دعویٰ بھی کر ڈالا کہ اس سے شادی کے لیے مینا کماری مذہب تبدیل کرنے کے لیے بھی تیار تھیں، تاہم مینا کماری نے ایک بار ان سب باتوں کی تردید کر دی۔ انہوں نے کہا کہ اگر ان کے ہاں اولاد ہوئی ہوتی تو شاید راہول جتنا بڑا ان کا بیٹا ہوتا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ فلمی کیریئر کی خاطر ان کا نام تبدیل ہو گیا، یہی کافی ہے لیکن شادی کے لیے مذہب تبدیل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مینا کماری کا پینے پلانے کا سلسلہ اسی طرح جاری تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ان کے گھر میں تقریباً تیس افراد رہتے تھے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی انہیں اُم الخبائث سے دور رکھنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ عین ممکن ہے کہ ایسی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوتی لیکن المیہ یہ ہے کہ ایسی کوئی کوشش ہونے کی ذرا سی بھی شہادت نہیں ملتی۔ اس کے برعکس یہ کوشش کی جاتی تھی کہ مینا کماری جب بھی اپنا پسندیدہ ”مشروب“ طلب کریں تو وہ ضرور گھر میں موجود ہو، خواہ ان کے کھانے کے لیے کچھ ہو یا نہ ہو۔

”صاحب بی بی اور غلام“ کے ہدایت کار ابرار علوی مینا کماری کے پڑوس میں ہی رہتے تھے۔ ایک بار انہوں نے کسی کو بتایا کہ چند دن پہلے، رات گئے کسی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ انہوں نے دروازہ کھولا تو مینا کماری کے ملازم کو سامنے کھڑے پایا۔ ملازم نے قدرے شرمندگی سے ابرار علوی کو بتایا کہ بیگم صاحبہ (مینا کماری) دیر سے شوٹنگ سے واپس آئی ہیں اور گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہے، اگر ان کے پاس ڈبل روٹی کے دو سلائس ہوں تو دے دیں!

کیا یہ مقام عبرت نہیں کہ پاک و ہند کی اپنے وقت کی سب سے بڑی ہیروئن رات گئے شوٹنگ ختم کر کے اپنے گھر آتی ہیں جس میں اس کے تقریباً 30 بہن بھائی، عزیز رشتے دار اس کے ساتھ رہتے ہیں، تو اسے گھر میں، کھانے کے لیے ڈبل روٹی کے دو سلائس میسر نہیں آتے؟ مینا کماری کی ایک سوتیلی بہن شمع جو عمر میں ان سے خاصی بڑی تھیں، اس گھر کا نظام چلاتی تھیں۔ ان سمیت گھر میں رہنے والے تمام افراد مینا کماری کی کمائی پر پل رہے تھے۔ ایک صاحب نے قدرے کھردرے الفاظ میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا تھا ”وہ سب مینا کماری کے ساتھ محض رہ نہیں رہے تھے، وہ اس کی بوٹیاں نوچ کر کھا رہے تھے... لیکن کوئی کیا کر سکتا تھا... خود مینا کماری کو اس صورت حال پر کوئی اعتراض نہیں تھا...!“

گھر میں حالات خواہ کچھ بھی تھے لیکن فلمی دُنیا میں مینا کماری بدستور مصروف تھیں۔ ان دنوں بھی، یعنی 1966ء سے 1967ء کے درمیان ان کے پاس چار فلمیں تھی جن کے نام تھے ’بہو بیگم‘، ’منجھلی دیدی‘، ’نور جہاں‘ اور ’ابھیل آشا‘۔ ’راہول نامی نوجوان زیادہ دن مینا کماری کی زندگی میں نہیں رہا۔ ان کی دوستی اور رفاقت صرف دو یا تین ماہ پر محیط رہی۔ مینا کماری کے عزیزوں، دوستوں اور دیگر قریبی لوگوں میں سے کسی کو بھی راہول پسند نہیں تھا۔ ان سب کی رائے تھی کہ مینا کماری نے راہول کو جتنا سر چڑھا رکھا تھا، وہ اس قابل نہیں تھا۔ کشور شرما نے تو اس معاملے میں مینا کماری سے باقاعدہ جھگڑا کر لیا۔ دونوں کے درمیان ناراضی اتنی بڑھی کہ کشور شرما، مینا کماری کا گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ اس کے کچھ دنوں بعد نہ جانے کیوں اور کس طرح راہول بھی منظر سے غائب ہو گیا۔

مینا کماری کا پینا پلانا جاری تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ رات گئے تک کام بھی کرنا پڑتا تھا۔ وہ بہت ہی کم وقت کے لیے سوتی تھیں۔ خوراک کا کوئی خاص خیال نہیں رکھتی تھیں۔ کسی بھی قسم کی ورزش نہیں کرتی تھیں۔ غرض یہ کہ زندگی کے کسی معاملے میں کوئی توازن نہیں تھا۔ ظاہر ہے، اس قسم کی بے اعتدالیوں کا نتیجہ خراب ہی نکلتا ہے۔ وہ موٹی ہونے لگیں۔ خاص طور پر پیٹ کچھ نمایاں نظر آنے لگا۔ اس کے علاوہ وہ اکثر بیمار بھی رہنے لگیں۔

ویسے بیماری ان کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ بچپن سے ہی اکثر بیمار رہتی تھیں۔ انہوں نے خود اپنے تحریر کیے ہوئے ایک مضمون میں لکھا تھا ”میرا اور دواؤں کا، بچپن ہی سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔“ تاہم اب ان کے بیمار رہنے کی وجوہ بالکل مختلف تھیں۔ بخار تو اب انہیں اکثر ہی رہنے لگا تھا۔ ان کے مستقل معالج، ڈاکٹر جے آر شاہ کو بھی ان کے مستقل بیمار رہنے پر تشویش رہنے لگی تھی۔ تاہم یہ بات تقریباً سبھی کو معلوم تھی کہ مینا کماری کے اکثر بیمار رہنے کی سب سے بڑی وجہ کثرت شراب نوشی تھی۔

ڈاکٹر شاہ نے کئی بار مینا کماری کو تلقین کی کہ اگر وہ شراب نوشی مکمل طور پر ترک نہیں کر سکتیں تو کم ہی کر دیں۔ مینا کماری ہر اچھا مشورہ دینے والے کے سامنے نہایت سعادت مندی سے سر ہلاتی تھیں اور نہایت شیریں لہجے میں اسے یقین دلاتی تھیں کہ وہ اس کے مشورے پر ضرور عمل کریں گی لیکن کرتی وہی تھیں جو ان کا دل چاہتا تھا۔ اپنی زندگی اور حالات سے نامطمئن اور ناآسودہ لوگ اکثر، شراب کو ایک سہارا سمجھ کر اس سے چمٹ جاتے ہیں جبکہ شراب ان کے لیے سہارے کے بجائے ایک سراب ثابت ہوتی ہے۔ مدہوشی ان کے لیے حالات سے فرار کا ایک راستہ بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر شاہ کو تشویش تھی کہ مینا کماری کی بیماری اس سے زیادہ سنگین اور شدید ہے جتنی بظاہر دکھائی دیتی ہے۔ آخر کار چند مخصوص ٹیسٹ کرانے پر اس کا شک درست نکلا۔ اسے پتا چلا کہ مینا کماری کا جگر ناکارہ ہو رہا تھا اور کافی بڑھ چکا تھا۔ اسی لیے ان کا پیٹ پھولا پھولا دکھائی دینے لگا تھا۔ سب مینا کماری پر زور دینے لگے کہ وہ اسپتال میں داخل ہو جائیں لیکن وہ کسی کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ آخر کار جب ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو ان کے گھر میں موجود عزیزوں اور رشتے داروں نے زبردستی انہیں پکڑ کے، ”ڈنڈا ڈولی“ کر کے ایمبولنس میں ڈالا اور ایک پرائیویٹ اسپتال لے گئے۔

چند دن کے علاج کے بعد ان کی طبیعت کافی بہتر ہو گئی لیکن اسپتال والوں نے دیانتداری سے بتا دیا کہ یہ عارضی افاقہ تھا، انہیں زیادہ جدید علاج کی ضرورت ہے اور اس میں اب تاخیر نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اگر ان کا جگر مزید خراب ہو گیا تو پھر وہ ٹھیک ہونے کے قابل ہی نہیں رہے گا۔ انہوں نے مینا کماری کو علاج کے لیے لندن جانے کا مشورہ دیا تھا۔ غنیمت تھا کہ مینا کماری نے یہ مشورہ قبول کر لیا۔

کشور شرما نے مینا کماری کو لندن لے جانے کے انتظامات کیے۔ وہ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک طالب علم کے طور پر لندن میں رہ چکے تھے۔ مینا کماری نے انہیں ہی اپنے ساتھ لندن لے جانے کا فیصلہ کیا۔ جون میں مینا کماری اور کشور شرما لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ پر اُترے۔ اس ماہ کے دوران لندن کا موسم اور وہاں کے لوگوں کا موڈ نہایت خوشگوار ہوتا ہے۔ ایک اسپتال میں مینا کماری کے لیے ایک بیڈ بک کرایا جا چکا تھا اور خاص طور پر ان کے لیے دو نرسوں کی خدمات حاصل کی جا چکی تھیں۔ شیلا شرلاک نامی ایک ڈاکٹر کو ان کا علاج کرنا تھا۔

دو ماہ مینا کماری کا علاج جاری رہا جس کے دوران کئی بار ان کے جگر کی بائیوپسی ہوئی۔ اس دوران مدھو، جو اب مسز کشور شرما بن چکی تھیں، بھی لندن پہنچیں اور پندرہ دن بہن کے ساتھ رہیں۔ دو ماہ کے علاج کے بعد، اگست کے دوران مینا کماری کی حالت بہت بہتر ہو گئی۔ مزید بحالی صحت کے لیے وہ کشور شرما کے ساتھ سوئٹزر لینڈ کے شہر جنیوا چلی گئیں جہاں انہوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ بحالی صحت کے لیے سوئٹزر لینڈ کو دُنیا کا بہترین ملک سمجھا جاتا ہے۔ وہاں کے خوبصورت نظاروں کے درمیان، صاف ستھری آب و ہوا میں مینا کماری بالکل تندرست اور صحت مند دکھائی دینے لگیں۔ ان دنوں وہ خوش بھی بہت تھیں۔ کشور شرما کا کہنا تھا ”کم از کم میں نے اس سے پہلے انہیں اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب انڈیا واپس جانے کا وقت آیا تو وہ ایک بار پھر افسردہ دکھائی دینے لگیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گھر واپس جانا نہیں چاہتیں۔“

تاہم مینا کماری کو گھر واپس آنا ہی پڑا۔ علاج، آرام اور صحت افزاء مقامات پر وقت گزارنے اور اس دوران مے نوشی مکمل طور پر بند ہو جانے کی وجہ سے وہ بالکل صحت مند دکھائی دے رہی تھیں۔ رنگت گلابی ہو گئی تھی۔ جسم چھریرا ہو گیا تھا اور پیٹ بھی صحیح حالت پر آ گیا تھا۔ ڈاکٹر شیلا شرلاک نے انہیں رُخصت کرتے وقت کہا تھا ”جس دن تم یہ ارادہ کر لو کہ اب مجھے جلد از جلد مر جانا چاہیے، اس دن ایک پیگ پی لینا۔“

ڈاکٹر نے انہیں شراب نوشی سے سختی سے منع کرنے کے علاوہ یہ ہدایت بھی کی تھی کہ وہ جلدی کام شروع نہ کریں اور جب شروع کریں تو صرف اتنا کام کرنے کو اپنی عادت بنائیں کہ انہیں ذرا بھی تھکن کا احساس نہ ہو، لیکن مینا کماری کے واپس آتے ہی ڈاکٹر کی یہ ہدایت دھری کی دھری رہ گئی۔ فلم ”ابھیل آشا“ کی شوٹنگ کے سلسلے میں انہیں کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ ڈائریکٹر کو جب پتا چلا کہ وہ فی الحال اسٹوڈیو نہیں آ سکتیں تو انہوں نے اسی ہاؤسنگ اسکیم میں شوٹنگ کے انتظامات کر لیے جہاں مینا کماری ایک ولا میں رہتی تھیں۔ یوں مینا کماری کو بہرحال، واپس آتے ہی کام شروع کرنا پڑ گیا۔

1969ء میں انڈین فلم انڈسٹری میں غیر محسوس طور پر تبدیلی کی ایک لہر آ رہی تھی۔ ڈائریکٹرز آزاد خیالی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مناظر کو ذرا بولڈ بنانے کے لیے راستے تلاش کیے جا رہے تھے۔ ملک میں آنے والی تھوڑی بہت انگریزی فلمیں بھی تبدیلی کی ہوا لے کر آ رہی تھیں۔ سیاحوں میں ایک بڑی تعداد ہپیوں کی ہوتی تھی جو ایک نیا ہی کلچر متعارف کرا رہے تھے۔ غرضیکہ وقت کروٹ لے رہا تھا۔ فلمی لوگ سنسر بورڈ کی پابندیوں کو بھی حتی الامکان نرم کرانے کے لیے کوشاں تھے۔

ظاہر ہے، دھیرے دھیرے نمودار ہوتی ہوئی ان تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نئی ہیروئنوں کی ایک کھیپ بھی سامنے آ رہی تھی جو وقت کے تقاضوں کے مطابق کام کرنے میں ہچکچاتی بھی نہیں تھیں اور اس کے لیے زیادہ موزوں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ ممتاز، راکھی اور ہیما مالنی جس طرح کی ساڑھیاں پہن سکتی تھیں، جس طرح کے کیمرے کے سامنے چل سکتی تھیں اور ہیرو کے ساتھ جس ناز و ادا کا مظاہرہ کر سکتی تھیں، ان معاملات میں مینا کماری ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔

اس کے علاوہ مینا کماری کی عمر بھی 36 سال ہو چکی تھی۔ ممبئی میں فلمی کہانیاں لکھنے والوں اور فلمیں بنانے والوں کا خیال غالباً یہ ہے کہ صرف 25 سال تک کی عمر کے لوگ محبت کر سکتے ہیں، اس کے بعد انسان محبت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ چنانچہ تمام رومانی فلموں کے ہیرو، ہیروئنیں عام طور پر تقریباً اسی عمر کی ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے، مینا کماری کی عمر اب یہ نہیں رہی تھی اور نہ ہی وہ اس عمر کے لوگوں جیسی ایکٹنگ کر سکتی تھیں۔ چنانچہ اب انہیں پہلے جیسے رول ملنے بہت کم ہو گئے تھے۔ اگر آپ ان کی 1969ء سے 1972ء کے درمیان کی فلموں کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی تعداد سات تھی لیکن ان میں سے صرف ایک میں وہ ہیروئن تھیں۔ انہیں بڑی بہن، عمر رسیدہ عورت یا بیوہ وغیرہ کے کردار ملنے لگے تھے۔

گلزار کا کہنا ہے کہ مینا کماری نے اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا اور انہیں اس پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پریشانی تو شاید نہ ہو لیکن وہ وقت کے ان انقلابات کے بارے میں سوچتی ضرور ہوں گی مگر چونکہ وہ ایک خوددار خاتون تھیں، اس لیے انہوں نے کبھی کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کی اداکارانہ صلاحیتیں اب پہلے سے کہیں بہتر ہو چکی تھیں، نئی ہیروئنیں ان کے سامنے طفل مکتب تھیں لیکن انہوں نے اپنے اس خیال کا اظہار کسی کے سامنے نہیں کیا اور جو کام ملتا رہا، سر جھکا کر اسے کرتی رہیں۔ ’جواب‘، ’دشمن‘، ’گومتی کے کنارے‘ میں ان کے کردار معمولی تھے لیکن مینا کماری نے انہیں بھی اپنی اداکاری سے لاجواب بنا دیا اور فلمی شائقین کو بتا دیا کہ بڑے فنکار چھوٹے کرداروں کو بھی ناقابل فراموش بنا دیتے ہیں۔

کیا مینا کماری نے لندن سے واپس آنے کے بعد دوبارہ پینا پلانا شروع کر دیا تھا یا پرہیز برقرار رکھا تھا؟ یہ بات صحیح طور پر کوئی بھی نہیں بتا سکا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ شراب چھوڑنے اور علاج کرانے کے بعد انہوں نے دوبارہ اسے ہاتھ نہیں لگایا لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کا پرہیز عارضی تھا، وہ دوبارہ اس بُری عادت کی طرف لوٹ آئی تھیں، تاہم اب اس معاملے میں کچھ اعتدال آ گیا تھا۔ پہلے جیسی بلا نوشی اب نہیں رہی تھی۔ تمام تر تحقیق کے باوجود یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سی بات درست تھی۔ تاہم زیادہ شہادتیں اس بات کی ہیں کہ انہوں نے پینی چھوڑ دی تھی۔ شاید انہوں نے لندن کی ڈاکٹر شیلا شرلاک کی اس بات کی سنگینی کو محسوس کر لیا تھا کہ ”جب تم مرنا چاہو تو ایک پیگ پی لینا۔“ (جاری ہے)

دھرمیندر آئے تو
یاد دلا دیے گئے

1969ء تک مینا کماری کے گھر میں رہنے والے بیشتر رشتے داران کے لیے ناقابل برداشت ہو چکے تھے۔ آئے دن مینا کماری کے ان سے جھگڑے ہونے لگے تھے۔ گھر کا کوئی نظام نہیں تھا۔ مینا کماری سمیت کسی کو صحیح پتا نہیں تھا کہ گھر میں کتنا پیسہ آرہا ہے اور کتنا خرچ ہو رہا ہے۔ مالی پریشانیاں شروع ہو چکی تھیں۔ انکم ٹیکس کا محکمہ الگ مینا کماری کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ اس نے نہ جانے کون کون سے پرانے حساب نکال لیے تھے اور پانچ لاکھ روپے سے زیادہ رقم ان کے ذمے واجب الادا قرار دے دی تھی۔ جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی

کچھ عرصے بعد انکم ٹیکس کے محکمے کی جانب سے مینا کماری کو نوٹس ملا کہ اگر انہوں نے پچھلے کئی سالوں کے ٹیکس کی واجب الادا رقم کا حساب جلد از جلد بے باق نہ کیا تو ان کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ چاروں طرف سے مینا کماری پر حالات کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ گھر کے ماحول سے وہ الگ بیزار تھیں۔ آخر کار انہوں نے کرائے کے اس گھر کو چھوڑ کر انکم ٹیکس کا حساب بے باق کرنے، دیگر قرضے ادا کرنے اور رہائش کے لیے ایک اپارٹمنٹ خریدنے کا فیصلہ کیا۔ ایک بار پھر گھر تلاش کرنے کی ذمہ داری کشور شرما کو سونپی گئی۔

کشور شرما نے مینا کماری کے لیے جو اپارٹمنٹ تلاش کیا وہ ”لینڈ مارک“ نامی ایک عمارت کی گیارہویں منزل پر تھا۔ گو کہ یہ ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا لیکن اس میں بھی مینا کماری تنہا رہنے کے لیے تیار نہ ہو سکیں۔ انہوں نے اپنی سب سے بڑی سوتیلی بہن خورشید کو بلا بھیجا جو اپنے بچوں سمیت ان کے ساتھ رہنے کے لیے آ گئیں۔ بہر حال پہلے کے مقابلے میں اب مینا کماری کے ساتھ رہنے والے افراد کی تعداد بہت کم تھی۔ انہوں نے اپنے تمام قرضے اور ٹیکس وغیرہ ادا کر دیئے۔ اس اپارٹمنٹ میں ایک بیڈ روم انہوں نے اپنے لیے، خاص طور پر اپنے ذوق کے مطابق آراستہ کرایا۔ اس میں ایک بڑا ایک شیلف بھی بنوایا جس میں ایلیٹر میکلین، ایملی برونٹے اور گلشن نندہ کے علاوہ دیگر کئی مصنفین کے ناول رکھے گئے۔ یہ ان کا پہلا ذاتی گھر تھا۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ پرائے یا پھر کرائے کے گھر میں رہی تھیں۔

اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہونے کے بعد وہ زیادہ تر اپنے بیڈ روم میں بند رہتیں۔ وہاں وہ اپنی ڈائری لکھتی رہتیں یا پھر کتابیں پڑھتیں۔ ان کے پاس کام اب بہت کم تھا اور وہ کام حاصل کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھیں۔ بلا ضرورت وہ اسٹوڈیو نہیں جاتی تھیں۔ ان دنوں ان کی مصروفیت صرف دو فلموں کے سلسلے میں تھی۔ ایک ”پاکیزہ“ اور دوسری ”میرے اپنے۔“

”میرے اپنے“ مینا کماری کے پسندیدہ ڈائریکٹر گلزار کی تھی جس میں وہ نہ تو ہیروئن تھیں اور نہ ہی ہیروئن کی بڑی بہن... بلکہ اس میں وہ ایک خاصی عمر رسیدہ عورت کا رول کر رہی تھیں۔ یہ ایک بنگالی فلم کاری میک تھی۔ موضوع خاصا بولڈ تھا۔ بطور ہدایتکار یہ گلزار کی پہلی فلم تھی اور اس کی ریلیز کے بعد فلمی ناقدین کی رائے تھی کہ گلزار نے اپنی پہلی ہی فلم میں خود کو ایک اچھا ہدایتکار ثابت کر دیا تھا۔ مینا کماری ان دنوں اپنے ہر جاننے والے سے کہتی تھیں ”آپ کو 'میرے اپنے' ضرور دیکھنی چاہیے۔“

مینا کماری کو اس فلم میں اپنی اداکاری پر ہر خاص و عام سے بہت داد ملی تھی۔ دیکھنے والوں کا کہنا تھا کہ مینا کماری کی پرفارمنس پر انہوں نے اپنے آنسو بڑی مشکل سے ضبط کیے تھے۔

1971ء شروع ہونے تک ان کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی۔ آئے دن انہیں اسپتال لے جایا جاتا تھا۔ زیادہ تر ان کا علاج سینٹ الزبتھ نرسنگ ہوم میں ہوتا تھا۔ بخار ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ اب ان کے پاس صرف ایک فلم ”گومتی کے کنارے“ نامکمل رہ گئی تھی جسے مکمل کرانے کی انہیں بہت فکر تھی۔ وہ اکثر اس کے فلمساز کو فون کر کے کہتیں ”بھئی جلدی میرا کام ختم کرالو... میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں...“

اس کے جواب میں فلمساز ہنس کر کہتا ”ارے میناجی! ابھی آپ بہت جیئیں گی۔ ہماری فلم انڈسٹری کو آپ کی بہت ضرورت ہے۔ ابھی تو آپ ہمیں اور بھی بہت سی یادگار فلمیں دیں گی۔“

29دسمبر 1971ء کو مینا کماری اس فلم میں اپنے حصے کا آخری سین پکچرائز کرانے آخری بار اسٹوڈیو گئیں۔ شوٹنگ ختم ہونے کے بعد ان کے تاثرات سے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے سر سے کوئی بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ 31دسمبر 1971ء کی رات ان کے پرانے چاہنے والے، دھرمیندر پیشگی اطلاع دیے بغیر ان سے ملنے آئے۔ دونوں بہت دیر تک ساتھ بیٹھے ماضی کی یادوں کے خزانے کھنگالتے رہے۔ پھر دھرمیندر جس طرح خاموشی سے آئے تھے، اسی طرح خاموشی سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مینا کماری کو کچھ دیر کے لیے نیند آ گئی اور اس دوران نیا سال شروع ہو گیا۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلا کہ کب 1971ء ختم ہوا اور 1972ء شروع ہو گیا۔

☆...☆...☆

ہم مینا کماری اور کمال امروہی کی یادگار فلم ”پاکیزہ“ کا الگ سے خصوصی تذکرہ کریں گے کیونکہ یہ فلم اس کی مستحق ہے اور اس کی اپنی ایک الگ تاریخ ہے۔ اس کی سب سے پہلی اور خاص طور پر قابل ذکر بات تو یہی ہے کہ اسے مکمل ہونے میں کم و بیش 13 سال کا عرصہ لگا۔ یوں اس نے اپنی تکمیل کے معاملے میں گویا ”مغل اعظم“ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔

اس سے پہلے ہم تذکرہ کر چکے ہیں کہ 1955ء میں جب مینا کماری اپنی فلم ”آزاد“ کی شوٹنگ کے سلسلے میں کھنڈالا گئی تھیں تو انہوں نے فون کر کے کمال امروہی کو بھی وہاں بلا لیا تھا۔ انہیں چند دنوں کی تعطیلات گزارنے کا بھی موقع مل گیا تھا جن کے دوران وہ خوب گھومے پھرے تھے۔ مدراس جواب چنائے کہلاتا ہے، اس کے بعض نہایت خوبصورت نظارے دیکھ کر کمال کے ذہن میں ایک فلم کا خیال ابھرا تھا۔ گو کہ اس فلم کے خدوخال یا کہانی کا خاکہ کمال کے ذہن میں واضح نہیں تھا لیکن انہوں نے اسی وقت اس کے لیے ایک نام ضرور سوچ لیا تھا... اور وہ نام تھا ”پاکیزہ۔“

واپس آنے کے بعد کمال امروہی دھیرے دھیرے اس فلم کی تیاریاں کرتے رہے۔ 18جنوری 1958ء کو انہوں نے نہایت سادگی سے اس فلم کی مہورت کی رسم بھی ادا کر ڈالی۔ سادگی کی انتہا یہ تھی کہ کمال اور مینا کماری اس ”تقریب“ کے دوران فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں نے ہاتھ اٹھا کر اس فلم کی کامیابی کے لیے دعا کی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت تک مختلف واہموں کی وجہ سے کئی بار اس فلم کا نام تبدیل کیا جا چکا تھا لیکن گھوم پھر کر آخر کار ”پاکیزہ“ پر ہی اتفاق رائے ہو گیا۔ مہورت کے وقت تک اس کے بارے میں یہ سوچا گیا تھا کہ اسے سنیما اسکوپ اور بلیک اینڈ وائٹ بنایا جائے گا۔

کمال امروہی نے اپنی فلم ”دائرہ“ کی ناکامی کے بعد ”پاکیزہ“ سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ ویسے وہ یہ فلم در حقیقت اپنی بیوی سے اپنی محبت کے اظہار کے طور پر بنانا چاہ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس فلم کے ذریعے مینا کماری بطور اداکارہ ایک لازوال مقام حاصل کر لیں۔ فلم کی کہانی بھی ہیروئن ہی کے گرد گھومتی تھی۔ کمال کا کہنا تھا کہ اس فلم کے اسکرپٹ کی ہر سطر لکھتے وقت ان کے ذہن میں مینا کماری کا تصور تھا۔ وہ انہیں ایک ایسی مکمل اور بھرپور عورت کے طور پر اسکرین پر پیش کرنا چاہتے تھے جو بیک وقت بے حد حسین، ذہین، حساس، اداس، جسمانی طور پر بے حد پُرکشش لیکن دل شکستہ دکھائی دے۔ کمال امروہی کے پبلک ریلیشنز منیجر نے ایک بار اس فلم کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا ”کمال صاحب یہ فلم اس جذبے کے ساتھ بنا رہے ہیں جس جذبے کے ساتھ شاہ جہاں نے اپنی ملکہ کے لیے تاج محل بنایا ہو گا۔“

اس فلم کا مرکزی کردار ایک طوائف یا رقاصہ تھی۔ کہانی کا موضوع نیا نہیں تھا لیکن کمال اسے ایک مختلف انداز اور مختلف زاویے سے پیش کرنا چاہتے تھے، جس طرح ان کے خیال میں اس سے پہلے کسی نے پیش نہیں کیا تھا۔

1960ء تک وہ کم از کم کاغذوں پر اس فلم سے متعلق ہر چیز مکمل کر چکے تھے۔ کمال امروہی کی ایک خاص عادت یہ تھی کہ جب وہ فلم کا اسکرپٹ اور دیگر چیزیں کاغذات پر فائنل کر لیتے تھے تو پھر ان میں ایک لفظ کا بھی ردّوبدل نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ”پاکیزہ“ گو کہ 1972ء میں جا کر ریلیز ہوئی لیکن فلم کی کہانی اور دیگر جزئیات جو 1960ء میں حتمی طور پر طے ہو چکی تھیں، ان میں آئندہ بارہ برسوں کے دوران ایک لفظ کی بھی تبدیلی نہیں ہوئی۔

کمال امروہی اس فلم کو نہایت شاہانہ انداز میں بنانا چاہتے تھے اور اس کا ہر کام بڑے اعلیٰ پیمانے پر کرنا چاہتے تھے۔ بیس سال فلم انڈسٹری میں رہ کر انہوں نے جو تجربہ حاصل کیا تھا، اسے پوری طرح اس فلم میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نظر شاید ”مغل اعظم“ پر تھی۔ کے۔ آصف نے ”مغل اعظم“ کی شاہانہ تاریخی کہانی کو شاہانہ انداز میں ہی بنایا تھا۔ انہوں نے جو معیار قائم کیا تھا، کمال امروہی شاید اسے بھی پیچھے چھوڑنا چاہتے تھے۔ اگر ”مغل اعظم“ میں جنگ و جدل، درباروں اور محلوں کے یادگار مناظر موجود تھے تو کمال امروہی ”پاکیزہ“ میں بازارِ حسن کی منظر کشی اور رقص کے مناظر کو یادگار بنانا چاہتے تھے۔ گو کہ ”مغل اعظم“ کے بھی زیادہ تر مکالمے کمال امروہی نے ہی لکھے تھے لیکن ان کے اور کے۔ آصف کے درمیان حقیقی زندگی میں ایک قسم کی رقابت اور مقابلہ بازی موجود تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ کسی زمانے میں کمال امروہی نے ”انارکلی“ کے نام سے جو فلم بنانے کی کوشش کی تھی اور سرمایہ کار کی طرف سے سرمائے کی فراہمی رک جانے کی وجہ سے جو ابتدائی مراحل میں ہی ٹھپ ہو گئی تھی، اس کی کہانی کافی حد تک ”مغل اعظم“ والی ہی تھی۔ ”انارکلی“ کے بارے میں کمال امروہی کے ذہن میں جو نقشہ تھا اور جس معیار کے مطابق وہ یہ فلم بنانا چاہتے تھے، اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے تو شاید وہی اس زمانے کی ”مغل اعظم“ ہوتی لیکن قدرت نے اس نام سے بننے والی عظیم الشان فلم کا کریڈٹ کے۔ آصف کے نصیب میں لکھا تھا۔

1961ء میں جب ”پاکیزہ“ کی فلمبندی کے لیے کیمرا حرکت میں آیا تو اس کے موسیقار غلام محمد، ہیرو اشوک کمار اور ہیروئن مینا کماری تھیں۔ بعد میں صرف یہ تبدیلی ہوئی کہ اشوک کمار فلم میں موجود تو رہے لیکن وہ ہیرو نہیں رہے۔ موسیقار غلام محمد اپنے کام میں سب سے تیز رہے۔ ابھی شوٹنگ بہت کم ہوئی تھی لیکن انہوں نے تمام گانے تیار کر لیے تھے اور فلم کی موسیقی کا کام مکمل کر لیا تھا۔ اپنا کام ختم کر کے وہ فلم مکمل ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

”پاکیزہ“ کے گانے 1972ء میں عوام کے کانوں تک پہنچے اور بے پناہ مقبول ہوئے۔ یہ گانے اس سے دس سال پہلے ریکارڈ ہوئے تھے۔

1961ء سے 1964ء تک ”پاکیزہ“ کا کام کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہا لیکن بہت کم فلم بن پائی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس زمانے میں مینا کماری بہت مصروف اداکارہ تھیں۔ تاہم وہ اپنے شوہر کی فلم کے لیے وقت نکالنے کی حتی الامکان کوشش کرتی تھیں۔ فلم کی سست روی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کمال امروہی اسے نہایت صبر و سکون سے شوٹ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ ہر شاٹ، ہر سین سے دلی طور پر مطمئن ہونے کے بعد کام آگے بڑھاتے تھے۔

ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ کہ اس زمانے میں مینا کماری اور کمال امروہی کی شادی ایک مسلسل بحران سے گزر رہی تھی۔ دونوں کی باہمی محبت کا رشتہ اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا لیکن مینا کماری کو احساس تھا کہ وہ اس فلم کے لیے ناگزیر ہیں کیونکہ کمال امروہی ایک انٹرویو میں کہہ چکے تھے کہ ”پاکیزہ“ دراصل مینا کماری ہی کا دوسرا نام ہے۔ مینا کماری کو اطمینان تھا کہ کمال امروہی ان کے بغیر یہ فلم نہیں بنا سکتے۔

1964ء تک، یعنی تین سال کے دوران ”پاکیزہ“ پر 40 لاکھ روپیہ لگ چکا تھا جو اس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اس رقم کا بڑا حصہ خوبصورت اور عظیم الشان سیٹ لگانے پر صرف ہوا تھا۔ چنانچہ اس دوران جب مینا کماری، کمال امروہی کے گھر سے چلی گئیں تو کمال امروہی کو گویا ایک بہت بڑے بحران کا سامنا تھا۔ ان کے سامنے ایک بہت بڑا سوال یہ آن کھڑا ہوا تھا کہ مینا کماری ”پاکیزہ“ میں کام جاری رکھیں گی یا نہیں؟

(جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات
دلوں میں بہت سی
رنجشیں آچکی تھیں

قسط:18

کمال امروہی کے لیے یہ سوچنا بھی محال تھا کہ وہ ''پاکیزہ'' پر جتنا کام کر چکے ہیں، جتنی شوٹنگ کر چکے ہیں، وہ سب ختم کر کے کسی دوسری اداکارہ کو کاسٹ کر کے نئے سرے سے فلم بنائیں۔ ایک تو وہ مالی طور پر اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب کا سب اس فلم پر لگا چکے تھے۔ دوسرے انہیں معلوم تھا کہ ''پاکیزہ'' میں سے اگر مینا کماری کا نام نکل گیا تو ڈسٹری بیوٹرز کی نظر میں اس فلم کی کوئی اہمیت نہیں رہے گی اور وہ اسے نہیں اٹھائیں گے۔

کمال امروہی کے قریبی ساتھی اور سیکرٹری باقر نے بتایا کہ مینا کماری جب کمال امروہی کا گھر چھوڑ کر گئیں، اس سے چند دن پہلے کمال نے مینا کماری سے کہا تھا ''مجھے معلوم ہے تم یہاں خوش نہیں ہو۔ تم کہیں اور جا کر رہنا چاہتی ہو تو ضرور چلی جاؤ... بلکہ میں خود تمہارے لیے کوئی گھر تلاش کر سکتا ہوں جہاں تم آزادی اور خود مختاری سے رہ سکو لیکن میں چاہتا ہوں کہ جانے سے پہلے تم صرف ایک وعدہ کر جاؤ... اور وہ یہ کہ تم ہر حال میں ''پاکیزہ'' کو مکمل کراؤ گی۔ مینا کماری نے نہ صرف اس موقع پر وعدہ کیا تھا بلکہ بعد میں بھی کئی بار یقین دہانی کرائی تھی کہ کمال سے صرف ان کے نجی تعلقات میں دراڑ آئی تھی لیکن ''پاکیزہ'' کے لیے بطور اداکارہ جب بھی ان کی ضرورت ہوگی اور انہیں بلایا جائے گا، تو وہ ضرور آئیں گی۔''

تاہم یہ صرف کہنے کی باتیں تھیں۔ دلوں میں اتنی رنجشیں آ چکی تھیں کہ کمال امروہی اور مینا کماری کی علیحدگی کے بعد کئی ماہ کے لیے ''پاکیزہ'' کا کام بالکل ٹھپ ہو کر رہ گیا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ کمال سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ فلم جتنی بن چکی تھی، اسے وہیں چھوڑ دیں اور مکمل کرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔ ویسے بھی وہ یہ فلم مینا کماری کے لیے بنا رہے تھے اور مینا کماری اب ان کے ساتھ نہیں رہی تھیں۔ وہ اب دل شکستہ تھے اور ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ یہ فلم بنانا ان کے لیے اور بھی مشکل ہو گیا تھا۔

ایک سال تک وہ اسی دل شکستگی کے عالم میں رہے اور فلم جہاں تھی، وہیں لٹکی رہی۔ آخرکار جب دل کچھ سنبھلا تو انہوں نے جذباتیت کی کیفیت سے نکل کر ایک بار پھر فلم کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ 1964ء اور 1965ء کے دوران بھی مینا کماری بطور اداکارہ عروج پر تھیں۔ ان کے پاس کام کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ ''پاکیزہ'' کے لیے ڈیٹس لینے ان کے پاس کون جائے؟ کمال امروہی کی انا پرستی انہیں اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ اپنی اس بیوی کے پاس فلم کے لیے ڈیٹس مانگنے جائیں جو انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

آخر انہوں نے یکے بعد دیگرے کچھ دوسرے لوگوں کو بیچ میں ڈالا جو مینا کماری سے ڈیٹس کی بات کرنے کے لیے جاتے رہے۔ مینا کماری نے نہ تو کبھی کسی کو انکار میں جواب دیا اور نہ ہی باضابطہ طور پر کوئی ڈیٹس دیں۔ انہوں نے معاملے کو بیچ میں لٹکائے رکھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ مینا کماری کے ''چندن میاں'' یعنی کمال امروہی ہر عید پر اپنی بیگم کو عیدی دیا کرتے تھے۔ انہوں نے بیگم سے علیحدگی کے بعد بھی اس روایت کو برقرار رکھا۔ اس دوران جتنی بھی عیدیں آئیں، وہ بیگم کو عیدی دینے کے لیے جاتے رہے لیکن انہوں نے کبھی ''پاکیزہ'' کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔

اس دوران ایک اور مسئلہ بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اشوک کمار کو 1958ء میں ''پاکیزہ'' کے ہیرو کے طور پر کاسٹ کیا گیا تھا لیکن اب، سات آٹھ سال بعد ان کی عمر ذرا زیادہ دکھائی دینے لگی تھی اور انہیں ہیرو کے کردار ملنے بند ہو چکے تھے۔ وہ زیادہ تر کیریکٹر رولز میں نظر آنے لگے تھے۔ کمال امروہی کو احساس تھا کہ انہیں ہیرو بھی کوئی دوسرا لینا ہوگا۔ اس فیصلے کے بعد ہیرو بھی کئی تبدیل ہوئے۔ اس سلسلے میں جتنے نام سامنے آئے، انہیں دیکھتے ہوئے ''فلم فیئر'' نے لکھا ''کمال امروہی نے گزشتہ برسوں میں شاید اتنی قمیضیں تبدیل نہیں کی ہوں گی جتنے انہوں نے اپنی فلم کے ہیرو تبدیل کیے ہیں۔''

جن اداکاروں کو ہیرو لیا گیا یا لینے کے بارے میں سوچا گیا، ان میں راجندر کمار، سنیل دت اور دھرمیندر بھی شامل تھے۔ دھرمیندر کو لینے کا خیال تو اس لیے ترک کیا گیا کہ کسی نے کمال کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ دھرمیندر سے مینا کماری کا معاشقہ مشہور رہا ہے، اس فلم کے سلسلے میں اگر انہیں دوبارہ اکٹھے ہونے کا موقع ملا تو مراسم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر نہ جُڑ جائے۔ آخرکار ''پاکیزہ'' کے فاریسٹ آفیسر کا کردار راجکمار کے حصے میں آیا۔ راجکمار کا درست تلفظ کے ساتھ مکالموں کی ادائیگی کا انداز کمال امروہی کو ذاتی طور پر پسند تھا۔ راجکمار پہلے تو یہ سوچ کر انکار کرنے لگے تھے کہ یہ کردار کئی اداکاروں کے پاس سے ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا۔ تاہم پھر کچھ سوچ کر انہوں نے ہامی بھر لی۔

وقت آگے بڑھ رہا تھا لیکن ''پاکیزہ'' جہاں رُکی ہوئی تھی، وہیں رُکی رہی۔ آخر 25 اگست 1968ء کو کمال امروہی نے مینا کماری کو خط لکھا ''ہمارے درمیان صرف ''پاکیزہ'' کی تکمیل کا معاملہ طے ہونے سے رہ گیا ہے۔ تم نے شرط رکھی ہے کہ جب تک میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا، تم ''پاکیزہ'' مکمل نہیں کراؤ گی۔ ٹھیک ہے، میں تمہیں اس بندھن سے... بلکہ ہر بندھن سے آزاد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میری درخواست ہے کہ کم از کم اس کے بعد تو تم ''اپنی پاکیزہ'' مکمل کرا دینا۔ بہت سے لوگوں کا نصیب اور روٹی روزی اس فلم سے وابستہ ہے اور اس کی تکمیل تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم ایک اسٹار ہو۔ تمہارے پاس اس وقت مقبولیت کی طاقت ہے۔ ''پاکیزہ'' ایک ڈوبتا ہوا جہاز ہے لیکن اگر تم چاہو گی تو یہ جہاز ساحل تک پہنچ جائے گا۔''

کمال امروہی ایک خوددار آدمی تھے۔ وہ شاید اس طرح کا خط کبھی نہ لکھتے لیکن 1968ء میں ان کے حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ مجبور ہو گئے تھے۔ انہیں اس کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا کہ مینا کماری کو کسی بھی طرح فلم مکمل کرانے پر آمادہ کریں۔ ان کے حق میں ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ 1968ء میں مینا کماری کے حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ بطور ہیروئن ان کی اپنی ڈیمانڈ بھی بہت کم ہو چکی تھی۔ اوپر سے ان کی صحت بھی خراب رہنے لگی تھی اور خرابیٔ صحت کی خبریں فلم انڈسٹری میں بھی گردش کرنے لگی تھیں۔ اس وجہ سے بھی ان کے پاس فلموں کی آفرز آنا کم ہو گئی تھیں۔ چنانچہ یہ ایک ایسا وقت تھا جب کمال امروہی کو ہی مینا کماری کی ضرورت نہیں تھی بلکہ مینا کماری کو بھی کمال امروہی کی ضرورت تھی کیونکہ کمال امروہی کے پاس ان کے لیے ایک بہت اہم، خوبصورت اور مرکزی کردار موجود تھا جو انہیں شوبز کی دنیا میں نئی زندگی دے سکتا تھا۔

اپنے شوہر کو چھوڑنے کے ٹھیک پانچ سال اور بارہ دن بعد 16 مارچ 1969ء کو مینا کماری ''پاکیزہ'' کی شوٹنگ کے ٹوٹے ہوئے سلسلے کو دوبارہ جوڑنے کے لیے اسٹوڈیو پہنچیں۔ کمال امروہی نے ان کا زبردست استقبال کیا، انہیں پیڑا کھلایا اور اس استقبالیہ تقریب کی باقاعدہ دستاویزی فلم بنوائی۔

مارچ 1969ء سے لے کر دسمبر 1971ء تک کمال امروہی اور مینا کماری، دونوں نے ''پاکیزہ'' کے سلسلے میں بڑی محنت کی۔ دونوں کے پاس وقت بھی تھا اور دونوں کے ہاتھ میں صرف یہی ایک فلم تھی۔ وہ ایک مشن کی طرح اسے مکمل کرنے میں مصروف رہے۔ ایک بار آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا۔ فلم کا یونٹ دو کاروں میں دہلی جا رہا تھا۔ مدھیہ پردیش میں شیوپوری نامی ایک قصبے کے قریب دونوں کاروں میں پٹرول ختم ہو گیا۔ آس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔

یونٹ کے کسی آدمی نے بتایا کہ صبح کے وقت ایک بس یہاں سے گزرتی ہے، جس سے کچھ پٹرول ملنے کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ کمال امروہی نے فیصلہ کیا کہ سب لوگ کاروں کے دروازے مقفل کر کے اور کھڑکیوں کے شیشے چڑھا کر رات گزاریں گے۔ سب لوگ گاڑیوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ علاقہ ڈاکوؤں کا گڑھ تھا اور وہ کوئی عام سے ڈاکو نہیں تھے۔ ان کی سفاکی اور بربریت کی کہانیاں دور دور تک مشہور تھیں۔

فلم یونٹ کے افراد کو گاڑیوں میں بیٹھے تقریباً ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ دس بارہ مسلح آدمی نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئے اور انہوں نے دونوں گاڑیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے ڈرا دھمکا کر کسی نہ کسی طرح گاڑیوں کے دروازے کھلوا لیے اور کہا کہ وہ ان لوگوں کو پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتے ہیں۔ کسی کو ان کی بات کا یقین نہیں تھا لیکن جیسا کہ ماؤزے تنگ نے کہا ہے کہ حکم تو بندوق والے کا ہی چلتا ہے، اس لیے فلم والوں کو بندوق برداروں کا حکم ماننا پڑا۔

دونوں کاروں میں تھوڑا تھوڑا پٹرول ڈالا گیا۔ بندوق برداروں کی ایک گاڑی ان کے آگے چلی اور ایک پیچھے۔ اس طرح چاروں گاڑیاں کچھ دیر بعد ایک عمارت کے گیٹ میں داخل ہوئیں۔ عمارت کے گرد وسیع احاطہ بھی تھا اور وہ ایک قسم کا ریسٹ ہاؤس معلوم ہوتی تھی۔ اس پر کوئی ایسی نشانی نظر نہیں آ رہی تھی جس کی بناء پر اسے پولیس اسٹیشن سمجھا جا سکتا۔ چنانچہ کمال امروہی نے گاڑی سے اترنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جس کسی کو بھی ان سے ملنا ہے، وہ خود گاڑیوں کے پاس آئے۔

چند منٹ بعد اندر سے ایک نوجوان ریشمی سلیپنگ سوٹ پہنے برآمد ہوا۔ اس نے اگلی کار کے قریب آ کر کمال امروہی سے پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو؟''

''میرا نام کمال امروہی ہے اور ہم لوگ شوٹنگ کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔'' کمال نے جواب دیا۔

اس پر وہ نوجوان گویا زیادہ چوکنا ہو گیا اور کمال کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ کسے شوٹ کرنے کے لیے نکلے ہوئے ہو؟''

تب کمال کو اندازہ ہوا کہ وہ نوجوان شوٹنگ کا مطلب گولیاں چلانا سمجھا تھا۔ تب انہوں نے جلدی سے وضاحت کی کہ وہ فلمی دنیا کے لوگ ہیں اور شوٹنگ سے ان کی مراد فلمبندی ہے۔ یہ جاننے کے بعد اس نوجوان اور اس کے بندوق بردار ساتھیوں کا رویّہ بالکل تبدیل ہو گیا۔ انہوں نے گاڑی میں موجود مینا کماری کو بھی دیکھا اور پہچان لیا۔ مینا کماری کی طبیعت اس وقت خراب تھی۔ اس دوران یہ واضح ہو چکا تھا کہ وہ لوگ ڈاکو تھے اور وہ نوجوان ان کا سردار تھا۔

وہ کوئی سرکاری ریسٹ ہاؤس ٹائپ جگہ تھی لیکن ان دنوں متروک تھی اور اس پر ڈاکوؤں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ وہ بڑے ٹھاٹ سے وہاں رہ رہے تھے۔ ان دنوں ڈاکو بھی فلمیں دیکھتے تھے۔ مینا کماری اور کمال امروہی کو انہوں نے پہچان لیا۔ ان کے ساتھ وہ یونٹ کے دوسرے لوگوں کو بھی نہایت عزت اور احترام کے ساتھ اندر لائے۔ ان سب کے لئے نہایت پُرتکلف کھانے کا انتظام کیا گیا۔ سب کی خوب خاطر مدارت ہوئی جس کے بعد ڈاکوؤں نے ان کے ساتھ مل کر ڈانس بھی کیا۔

صبح ان کے لیے پٹرول کا انتظام کیا گیا اور ڈاکوؤں کے سردار نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ اپنی ''حفاظت'' میں انہیں کچھ دور تک چھوڑ کر آئیں لیکن انہیں رخصت کرنے سے پہلے سردار نے ایک چاقو نکالا اور مینا کماری سے فرمائش کی کہ وہ اس کی نوک سے اس کی ہتھیلی پر آٹوگراف دیں۔ مینا کماری نے زندگی میں لاتعداد لوگوں کو آٹوگراف دیئے تھے لیکن چاقو کی نوک سے کسی کی ہتھیلی پر آٹوگراف دینے کا یہ پہلا موقع تھا۔ کانپتے ہاتھ سے انہوں نے ڈاکوؤں کے سردار کی فرمائش پوری کی۔ سردار کی ہتھیلی سے خون رسنے لگا لیکن وہ اس خیال سے بہت خوش تھا کہ یہ آٹوگراف اس کی ہتھیلی سے کبھی نہیں مٹ سکے گا۔ اس نے مینا کماری کا بہت شکریہ ادا کیا۔

فلم یونٹ کے لوگ جب اگلے قصبے میں پہنچے تو انہیں پتا چلا کہ ڈاکوؤں کے جس گروہ کی مہمانداری میں وہ رات گزار کر آ رہے تھے، وہ مدھیہ پردیش صوبے کے مشہور ترین... یا پھر بدنام ترین ڈاکو امرت لال کا گروہ تھا۔ جس نوجوان نے چاقو کی نوک سے اپنی ہتھیلی پر مینا کماری سے آٹوگراف لیے تھے، وہ امرت لال ہی تھا جس کی دہشت پورے صوبے میں پھیلی ہوئی تھی!

(جاری ہے)

اداکارہ مینا کماری کی داستانِ حیات

قسط:19

”پاکیزہ“ کی تکمیل کے سلسلے میں کمال امروہی کو بے شمار دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخر کار، کسی نہ کسی طرح 1971ء میں فلم مکمل ہوگئی۔ صرف ایڈیٹنگ کا کام رہ گیا۔ یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ 1958ء سے 1972ء کے دوران، یعنی اس فلم کی تکمیل کے اس طویل عرصے میں، اس فلم سے وابستہ لوگوں پر کیا گزری۔ ان میں سے کچھ بوڑھے ہوگئے، کچھ انتقال کر گئے۔ کچھ نے خود ہی فلمی دنیا چھوڑ دی اور کچھ کو فلمی دنیا نے چھوڑ دیا۔

ان میں سب سے زیادہ افسوسناک صورتحال کا شکار اس فلم کے موسیقار غلام محمد ہوئے۔ 1965ء کے بعد سے انڈین فلموں میں خالص مشرقی موسیقی کے لیے گویا جگہ ہی نہیں رہی تھی۔ گھٹیا قسم کی مغربی موسیقی کی نقالی کر کے گانے بنائے جا رہے تھے اور یہ رواج زور پکڑ رہا تھا۔ غلام محمد ایک کلاسیکل موسیقار تھے اور اپنے انداز میں کام جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ ”ہاؤ ہو“ والی موسیقی سے قطعی متاثر نہیں ہوئے تھے۔ کمال امروہی نے اصل فن موسیقی میں ان کی مہارت دیکھتے ہوئے ہی انہیں ”پاکیزہ“ کے لئے سائن کیا تھا۔ غلام محمد نے فلم کے آغاز میں ہی اپنا کام مکمل کر لیا تھا اور تمام گانے ریکارڈ کر لیے تھے۔

☆چلو دلدار چلو، چاند کے پار چلو

☆انہی لوگوں نے لے لینا دوپٹہ میرا

☆یونہی کوئی مل گیا تھا، سرِ راہ چلتے چلتے

☆آج کی رات محبت کا اثر دیکھیں گے

☆موسم ہے عاشقانہ

☆تھاڑے رہیو او بانکے یار

یہ تو ”پاکیزہ“ کے ایسے گانے تھے جنہوں نے فلم انتہائی تاخیر سے ریلیز ہونے کے باوجود مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کر دیئے۔ دیگر چند گانے بھی اسی طرح کلاسیکل رنگ لیے ہوئے تھے۔ ”مغل اعظم“ ہی کی طرح فلم کی طوالت کے باعث بعض شہروں میں فلم کے جو پرنٹس ریلیز کیے گئے، ان میں ایک، دو یا تین گانے کم تھے جو فلم میں شامل نہیں کئے گئے تھے اور ایڈٹ کر دیئے گئے تھے۔ ”پاکیزہ“ کے ان تمام گانوں کی موسیقی اور دُھنوں کے خالق غلام محمد تھے مگر فلم کے لٹک جانے کی وجہ سے غلام محمد کا یہ شاندار کام لوگوں کے سامنے نہ آ سکا اور انہیں بطور میوزک ڈائریکٹر مزید کسی فلم میں کاسٹ کرنے کے لیے کسی ڈائریکٹر، پروڈیوسر نے ان سے رجوع نہ کیا۔

زندگی گزارنے کے لیے انہیں بہر حال کام کی ضرورت تھی۔ وہ کوئی خوشحال آدمی نہیں تھے۔ اوپر سے ”پاکیزہ“ کا کام مکمل کرنے کے بعد ایک طویل عرصے تک بے کار بیٹھے رہنے کے نتیجے میں بالکل ہی تنگدست ہوگئے۔ آخر کار انہوں نے کسی سے ایک ٹیپ ریکارڈر مستعار لیا۔ اس ٹیپ ریکارڈر میں ”پاکیزہ“ کے گانوں کی کیسٹ لگا کر وہ روزانہ پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کے دفتروں کے چکر لگاتے۔ وہ ہر ایک کو ”پاکیزہ“ کے گانے سنا کر بتانے کی کوشش کرتے کہ وہ کس درجے کے موسیقار ہیں لیکن کوئی بھی ان گانوں سے متاثر نہ ہوتا۔ بعض تو ناک بھوں چڑھاتے اور تبصرہ کرتے ”آج کل اس قسم کی موسیقی کون سنتا ہے؟“

کیا یہ وقت کی ستم ظریفی نہیں کہ غلام محمد سے یہ بات 1968ء میں کہی جا رہی تھی جبکہ عمدہ موسیقی کا ذوق رکھنے والے آج 2017ء میں بھی ان گانوں کو سن کر سر دُھنتے ہیں۔ غلام محمد روزانہ ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر دفتروں کے چکر لگاتے رہے اور بے نیل و مرام واپس آتے رہے۔ کسی نے انہیں کام نہیں دیا۔ اسی سال کے دوران وہ بیمار ہوگئے۔ ان کے پاس علاج معالجے اور دوا دارو کے لیے تو کیا، دو وقت کی روٹی کے لیے بھی پیسے نہیں تھے۔ آخر کار اسی طرح بیماری، تنگدستی، گمنامی اور کسمپرسی کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ آج کسی کو شاید ان کا نام بھی یاد نہ ہو۔ بعد از مرگ وہ ”پاکیزہ“ پر ہی بہترین موسیقار کے لیے اور مینا کماری بہترین اداکارہ کے طور پر فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئیں لیکن ایوارڈ دونوں ہی کو نہیں ملا۔ کمال امروہی بھی بہترین ڈائریکٹر کے فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزد ہوئے تھے لیکن ایوارڈ انہیں بھی نہیں ملا تھا۔ صرف سیٹ ڈیزائنر کو ایوارڈ ملا۔

فلم کی تکمیل کے دوران مینا کماری اور کمال امروہی کے درمیان مراسم نہایت خوشگوار رہے۔ ان کا انداز ایک ڈائریکٹر اور ایک اداکارہ کا نہیں، بلکہ تقریباً میاں بیوی جیسا ہی تھا۔ ان کے درمیان صرف جسمانی تعلق نہیں تھا، باقی ہر اعتبار سے وہ میاں بیوی کی طرح ایک دوسرے کا خیال رکھ رہے تھے۔ کمال کا کہنا تھا کہ اس دوران مینا کماری کو شاید یہ احساس بھی ہوگیا تھا کہ شوہر کا گھر چھوڑ کر انہوں نے غلطی کی تھی۔ کمال کے بیان کے مطابق ایک شام مینا کماری پھوٹ پھوٹ کر روئی بھی تھیں اور انہوں نے کہا تھا ”چندن! میں ان لوگوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی جنہوں نے تمہارے اور میرے درمیان غلط فہمیوں کی دیوار کھڑی کر کے ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور ہماری ازدواجی زندگی تباہ کر دی۔“

کمال امروہی نے تو یہ اشارہ بھی دیا کہ مینا ان کے گھر واپس آنے کے امکانات پر بھی غور کر رہی تھیں لیکن کمال اب خود اس بات کو بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ جبکہ مینا کماری کی سوتیلی بہن خورشید کا دعویٰ ہے کہ یہ باتیں کمال امروہی کے تخیل کی پیداوار ہیں، پاکیزہ کی تکمیل کے دوران دونوں کے مراسم صرف پیشہ ورانہ تھے، مینا کماری کے دل میں کمال امروہی کے لیے کسی بھی قسم کے جذبات نہیں رہے تھے۔ خورشید کا تو یہ بھی دعویٰ تھا کہ ”پاکیزہ“ کی شوٹنگ کے دوران مینا کماری کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا۔ ان کے کھانے اور دواؤں کا خیال نہیں رکھا گیا۔ ایک پہاڑ سے ان کے اُترنے کے منظر کے لئے 26 ری ٹیکس لی گئیں۔ یعنی 26 مرتبہ انہیں پہاڑ پر چڑھنا اور اترنا پڑا۔ تاہم فلم کے یونٹ میں شامل ایک شخص نے بتایا تھا کہ یہ شکایت بے بنیاد تھی۔ اس منظر کی اتنی ری ٹیکس ہرگز نہیں ہوئی تھیں۔

خورشید کا یہ دعویٰ تو درست معلوم ہوتا ہے کہ مینا کماری کے دل میں کمال امروہی کے لیے کوئی جذبات نہیں رہے تھے۔ اس کا اندازہ ان باتوں سے ہوتا ہے کہ ”پاکیزہ“ کی تکمیل کے بعد مینا کماری نے کبھی کمال سے ملنے کی کوشش نہیں کی اور مینا کے انتقال کے بعد جب ان کی وصیت سامنے آئی تو اس میں کمال امروہی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔

جنوری 1972ء تک ”پاکیزہ“ ریلیز نہیں ہوئی تھی لیکن پورے انڈیا میں اس کے چرچے ہو رہے تھے۔ اخبارات و رسائل میں اس کے بارے میں قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ فلمی پنڈتوں کو سب سے زیادہ تجسس اس بات کا تھا کہ فلم میں مینا کماری کا جس قسم کا کردار تھا، کیا اس کی مناسبت سے اس عمر میں وہ فلمی شائقین کی توقعات پر پوری اتر سکیں گی؟ کیا وہ اس کردار میں جچی ہوں گی؟

آخر کار 3 فروری 1972ء کو فلم ریلیز کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ اس روز ممبئی کے ساحلوں کے قریب سمندر میں ایک بوٹ گشت کرتی پھر رہی تھی جس کے بادبان ”پاکیزہ“ کے پوسٹرز پر مشتمل تھے اور جس میں طاقتور اسپیکرز پر اس فلم کے گانے چل رہے تھے۔ فلم کی نمائش کے لیے ”مراٹھا مندر“ سنیما مرکزی تھیٹر تھا۔ پریمیئر شو کا اہتمام وہیں کیا گیا تھا۔ کم و بیش 15 برس کے انتظار کے بعد وہ فلم جو سنیما اسکوپ، مگر بلیک اینڈ وائٹ بنی تھی، تقریباً ڈیڑھ کروڑ روپے کی لاگت سے، ایسٹ مین کلر میں تیار ہو کر ریلیز ہو رہی تھی۔ ڈیڑھ کروڑ روپے اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔

پریمیئر شو دیکھنے کے لیے مینا کماری بھی آئیں۔ اس وقت کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری پریمیئر شو ہے۔ راجکمار نے ان کے ہاتھ کو بوسہ دے کر ان کا استقبال کیا۔ وہ حسب معمول سفید ساڑھی میں تھیں۔ دیگر لوازمات بھی سفید ہی تھے۔ راجکمار کے ساتھ وہ سنیما ہال میں داخل ہوئیں۔

فلم کی ریلیز کے دوسرے دن اخبارات مایوس کن تبصروں سے بھرے پڑے تھے۔ ”ٹائمز آف انڈیا“ نے اسے ”خطیر سرمائے کا ضیاع“ قرار دیا۔ ”فلم فیئر“ نے اپنے تبصرے میں اسے صرف ایک ”اسٹار“ دیا، جس کا مطلب تھا کہ فلم معمولی درجے کی ہے۔ کئی بڑے اور نامی گرامی تبصرہ نگاروں نے تو اسے تبصرے کے قابل ہی نہیں سمجھا اور اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دی لیکن اردو پریس، فلم کی تعریفوں سے بھرا پڑا تھا۔ اردو کے تبصرہ نگاروں کے خیال میں، ایک طویل وقفے کے بعد بطور ہیروئن مینا کماری کی واپسی دھماکا خیز تھی اور انہوں نے ثابت کر دیا تھا کہ ان کا کوئی ثانی نہیں۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ مینا کماری کے بغیر ”پاکیزہ“ کچھ بھی نہیں تھی۔

تاہم ”پاکیزہ“ کے ایک شاندار فلم ہونے کا کریڈٹ کمال امروہی کو بھی جاتا ہے۔ ہمیں ایک ایسے شخص سے یہ کریڈٹ نہیں چھیننا چاہیے جس نے زندگی میں صرف تین ہی ذاتی فلمیں بنائیں۔ کمال امروہی نے اس وقت بھی مینا کماری کو ہی اپنی فلم کی ہیروئن رکھا جب ان پر زوال آ چکا تھا اور کوئی دوسرا ڈائریکٹر یا پروڈیوسر انہیں اپنی فلم میں ہیروئن نہیں لے رہا تھا۔ انہوں نے اس وقت راجکمار کو ہیرو لیا جب راجیش کھنہ کا طوطی بول رہا تھا۔ انہوں نے غلام محمد کو میوزک ڈائریکٹر لیا جنہیں اس سے پہلے کوئی جانتا نہیں تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں اپنی صلاحیتوں پر کتنا اعتماد تھا۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ فلم ابھی سنیماؤں میں لگی ہوئی تھی جب مینا کماری کا انتقال ہوگیا۔ ان کے غیر متوقع انتقال کی وجہ سے فلم کو بے پناہ شہرت ملی اور لوگ اسے دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ ابتداء میں فلم نے ضرور کم رش لیا لیکن پھر رش بڑھتا چلا گیا۔ ایسا کئی فلموں کے ساتھ ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ ”شعلے“ جیسی تاریخ ساز فلم کے بارے میں بھی شروع میں سمجھا گیا تھا کہ یہ ایک فلاپ فلم ہے۔ مینا کماری کے انتقال کے بعد اگر ”پاکیزہ“ نے بے حساب رش لیا تو وہ دراصل مینا کماری کے ان عقیدت مندوں کا رش تھا جو دوسری، تیسری یا چوتھی مرتبہ فلم دیکھ کر، تصور ہی تصور میں ان کا ہاتھ تھام کر ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو جانا چاہتے تھے، ان کی پرانی فلموں کو یاد کرنا چاہتے تھے، انہیں اپنی خاموش عقیدت کا نذرانہ پیش کرنا چاہتے تھے یا ان کے لیے دو آنسو بہانا چاہتے تھے۔

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ”پاکیزہ“ کو کمال امروہی کی فلم کہا جائے یا مینا کماری کی؟ دونوں میں سے کوئی ایک بھی نہ ہوتا تو یہ فلم نہیں بن سکتی تھی اور اگر کسی طرح بن بھی جاتی تو اسے یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا تھا جو آج بولی وڈ کی تاریخ میں حاصل ہے۔

”پاکیزہ“ سے ہم ایک بار پھر مینا کماری کی طرف آتے ہیں۔ وہ 24 مارچ 1972ء کا دن تھا۔ خورشید، مینا کماری اور مدھو، تینوں بہنیں اپنے باندرہ والے فلیٹ میں تاش کھیل رہی تھیں۔ مینا کماری بازی جیتتی دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید اس لیے مدھو پتا پھینکنے سے پہلے گہری سوچ میں تھی۔ آخر کار مینا کماری بول اٹھیں۔ ”پتا پھینکو بھئی... لگتا ہے یہ بازی ختم ہونے کے انتظار میں مجھے تو موت آ جائے گی۔“

مینا کماری کی سوتیلی، سب سے بڑی بہن خورشید انہیں ”منا“ کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ وہ مینا کماری کی بات سن کر ذرا خفگی سے بولیں۔ ”منا! تم آج کل اکثر ہی مرنے کی باتیں کرتی رہتی ہو۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اگر موت آنی ہی ہوگی تو سب سے پہلے مجھے آئے گی کیونکہ میں سب سے بڑی ہوں۔“

مدھو شاید بات کو مزاح کا رنگ دینے کے لئے بولی ”بھئی، سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے میرا اخلاقی فرض ہے کہ میں سب سے پہلے مروں۔“

”تم دونوں تو بچوں اور خاندان والی ہو۔ تم پر ان کی ذمے داریاں ہیں۔ تمہیں ابھی زندہ رہنا چاہیے۔ میرا کیا ہے، میرا تو نہ کوئی بچہ ہے اور نہ مجھ پر کوئی ذمے داری ہے۔“ مینا کماری نے یہ افسردہ کر دینے والی بات بڑے خوشگوار لہجے میں کہی۔

”آپ پر ہی تو سب سے زیادہ ذمے داریاں ہیں۔ آپ نے ہم سب کی... اتنے بہت سے لوگوں کی ذمے داریاں اٹھا رکھی ہیں۔“ مدھو نے اعتراف کیا۔

”ارے چھوڑو ان باتوں کو...“ مینا کماری نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”سب اپنے نصیب کا کھاتے ہیں۔ میرا مرنے کی باتیں کرنا اس لیے بھی زیادہ موزوں لگتا ہے کہ میں نے اپنے لیے مکہ سے کفن منگوا کر رکھا ہوا ہے۔“

مینا کماری ان دنوں مرنے کی باتیں شاید اس لیے بھی کرنے لگی تھیں کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ہر تھوڑے دنوں بعد ان پر ایک عجیب سی بیماری کا حملہ ہوتا۔ ان کے بازو اور ٹانگیں سوج جاتیں۔ ان کے لیے حرکت کرنا بھی بہت مشکل ہو جاتا۔ اس دوران ان کا زیادہ وقت بستر میں لیٹ کر یا کئی تکیوں کے سہارے بیٹھ کر گزرتا۔ ان دنوں میں ان کی ملازمہ نرمل معمول سے بڑھ کر ان کی خدمت کرتی۔

ایک فلمی صحافی نے مینا کماری کی بیماری اور بیکاری کے دنوں میں ان سے اپنی آخری ملاقات کا احوال کچھ یوں لکھا ہے:

”وہ یقیناً کافی تکلیف میں تھیں لیکن پوری کوشش کر رہی تھیں کہ ان کے چہرے سے تکلیف کا اظہار نہ ہو، حتیٰ کہ وہ مسکرانے کی بھی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کا پیٹ پھولا ہوا تھا جیسے اس میں پانی بھر گیا ہو۔ میرے لیے اُنہیں اس حالت میں دیکھنا خاصا تکلیف دہ تھا۔ وہ بڑی مشکل سے بات کر رہی تھیں۔ پھر گفتگو کے دوران اچانک اور بے اختیار ان کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ وہ بے حد شرمسار اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولیں۔ ’میرے پورے وجود میں درد ہے لیکن درد کی شدت میں بھی مجھے چیختے ہوئے بہت شرم آتی ہے۔‘ مجھے معلوم تھا، وہ سچ بول رہی ہیں۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں جو زندگی بھر روحانی اور جسمانی درد خاموشی سے سہہ لیتی ہیں۔“

(جاری ہے)

وہ فانی نہیں

حقیقی زندگی کا منظر تھا

آخری قسط

25 مارچ 1972ء کو مینا کماری کی تکلیف بہت بڑھ گئی۔ جسم کو ذرا سی حرکت دینا بھی ان کے لیے محال ہو گیا۔ خورشید انہیں ڈاکٹروں کی تجویز کردہ دوائیں دے رہی تھیں اور دیگر ہدایات پر بھی عمل کر رہی تھیں۔ اس دوران حالت ذرا سنبھلی تو مینا کماری نے خورشید سے کہا۔ ''آپا! میرا خیال ہے کہ میرا آخری وقت اب زیادہ دور نہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں سارے کام نمٹا کر جا رہی ہوں۔ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ مینا ہمارا فلاں کام ادھورا چھوڑ گئی۔ کمال صاحب کی 'پاکیزہ'، پریم جی کی 'دشمن' اور ساون کمار کی 'گومتی کے کنارے' مکمل ہو چکی ہیں۔ میں کوئی فلم ادھوری چھوڑ کر نہیں جا رہی۔ میرے پاس بچا کھچا جو کچھ ہے، وہ میں تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ میں موت کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہوں۔''

ان کی وہ رات سخت تکلیف میں گزری۔ وہ بار بار تکیے پر سر پٹختی رہیں۔ پھر انہیں آکسیجن لگا دی گئی۔ صبح ان کے معالج، ڈاکٹر شاہ کو بلایا گیا۔ خورشید نے کمال امروہی کو بھی ان کی حالت سے مطلع کر دیا۔ وہ فوراً آ گئے۔ ڈاکٹر شاہ کے خیال میں مینا کماری کی حالت سیریس تھی۔ انہوں نے مشورے کے لیے ایک اور سینئر ڈاکٹر مودی کو بلا لیا۔ دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ انہیں کسی ایسے اسپتال میں داخل کرانا ضروری تھا جہاں جدید طبّی سہولتیں موجود ہوں۔ مینا کماری اسپتال جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اسپتالوں اور کلینکوں کے چکر لگاتے ہی گزرا تھا، اب اگر موت ہی مقدر تھی تو وہ اپنے گھر پر، اپنے بستر پر مرنا چاہتی تھیں۔ تاہم ڈاکٹر شاہ نے ان کی ضد کو نظرانداز کرتے ہوئے انہیں ایک جدید اور عمدہ اسپتال ''سینٹ الزبتھ نرسنگ ہوم'' میں داخل کرانے کے انتظامات کر لیے اور ان کے لیے ایک پرائیویٹ کمرا بک کرا لیا۔ یہ اسپتال مالا بار ہلز کے علاقے میں واقع تھا۔

28 مارچ کو صبح دس بجے جب مینا کماری کو اسپتال لے جانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور ایمبولینس کے لیے فون کر دیا گیا تھا، تو مینا کماری نے خورشید سے پوچھا ''آپا! گھر میں کتنے پیسے ہیں؟''

خورشید نے اِدھر اُدھر دیکھنے اور کچھ جگہوں کو کھنگالنے کے بعد بتایا کہ گھر میں صرف ایک سو روپے موجود ہیں۔ وہ عورت جس نے زندگی میں لاکھوں کمائے اور لاکھوں لٹائے، اس کے گھر میں اس وقت صرف سو روپے تھے۔ مینا کماری سوچ میں پڑ گئیں کہ ان حالات میں وہ کیسے ایک نہایت مہنگے اسپتال میں داخل ہونے جا سکتی تھیں؟ ان کی فلم ''پاکیزہ'' اس وقت بھی سینماؤں میں چل رہی تھی اور کمال امروہی کو اس سے لاکھوں کی آمدنی ہو رہی تھی۔ کمال امروہی سے وہ جتنی رقم چاہتیں، ان کے ایک اشارے پر انہیں مل سکتی تھی لیکن کمال امروہی سے مانگنا مینا کماری کو گوارا نہیں تھا۔

کمال امروہی کے بیان کے مطابق، انہیں مینا کماری کی مالی دشواریوں کی اُڑتی اُڑتی خبریں مل چکی تھیں اور ایک دن وہ نوٹوں سے بھرا بریف کیس لے کر، مینا کماری کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہے تھے کہ شاید کوئی ان سے رقم مانگ لے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ اگر وہ خود مینا کماری کے علاج کے لیے رقم دینا چاہیں گے تو وہ ہرگز نہیں لیں گی۔ یہی ہوا، مینا کماری نے انہیں کوئی پیغام بھیجنے کے بجائے خورشید سے کہا کہ وہ پروڈیوسر پریم جی کو فون کرے، ان کے ذمے مینا کی کچھ رقم نکلتی تھی۔ خورشید نے انہیں فون کیا تو انہوں نے فوراً اپنے آدمی کو دس ہزار روپے دے کر روانہ کر دیا۔

یہ خبر سننے کے بعد مینا کماری آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اسپتال جانے کے لیے تیار ہونے لگیں۔ چند لمحے وہ یوں آئینے کی طرف دیکھتی رہیں جیسے آخری بار اپنا عکس دیکھ رہی ہوں۔ پھر انہوں نے مڑ کر خورشید سے کہا ''آپا! اس بار میں زندہ واپس نہیں آؤں گی۔ میرے بعد میرے اس بیڈ روم کو تالا لگا دیجئے گا اور میری قبر ماں جی اور بابو جی (والد) کی قبروں کے پاس بنوایئے گا۔''

خورشید رونے لگیں۔ اس دوران پریم جی کا آدمی دس ہزار روپے لے کر آن پہنچا۔ مینا کماری نے پانچ ہزار ڈاکٹر شاہ کو دیئے اور پانچ ہزار خورشید کو گھر کے اخراجات کے لیے دے دیئے۔ مینا کماری نے سب گھر والوں کو خدا حافظ کہا تو خورشید کی سب سے چھوٹی بیٹی پنکی اُن سے لپٹ کر رونے لگی۔ یہ بچی اور مینا کماری ایک دوسرے سے بہت پیار کرتی تھیں۔ مینا کماری نے خورشید کو ہدایت کی کہ وہ کمال صاحب کو نہ بتائے کہ انہیں اسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔

خورشید کا سہارا لے کر وہ لفٹ تک پہنچیں اور ہندو لفٹ آپریٹر کو نمستے کہا۔ لفٹ آپریٹر نے بھی انہیں سہارا دیا اور چپکے چپکے رونے لگا۔ نیچے پہنچ کر انہوں نے بنگالی چوکیدار کو سلام کیا تو وہ بھی انہیں اس طرح لوگوں کا سہارا لیے دیکھ کر رونے لگا۔ کارٹر روڈ کے کچھ حصے میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ مینا کماری کو اسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ ایمبولینس کے ارد گرد بھی کم و بیش سو افراد جمع ہو چکے تھے جو سوگوار چہرے لیے خاموش کھڑے مینا کماری کو ایمبولینس میں بٹھائے جانے کا منظر دیکھتے رہے۔ یہ کوئی فلمی منظر نہیں تھا۔ آج مینا کماری کوئی سین شوٹ نہیں کرا رہی تھیں۔

اس دوران بلڈنگ میں جھاڑو دینے والی عورت کو اس صورت حال کا پتا چلا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دوڑی دوڑی آئی اور ایمبولینس کا دروازہ پکڑ کر رونے لگی۔ مینا کماری نے ایک مضمحل سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے رونے سے منع کیا۔ وہ روز فلیٹ کی صفائی کے لیے آتی تھی تو مینا کماری دو چار روپے اسے دیا کرتی تھیں۔ آج انہوں نے اپنا ہینڈ بیگ ہی اسے دے دیا۔ خورشید اور مدھو، مینا کماری کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھیں۔

ڈاکٹر شاہ کو بڑی مشکل سے 65 روپے یومیہ کرائے پر سینٹ الزبتھ نرسنگ ہوم میں پرائیویٹ اور ایئر کنڈیشنڈ کمرا ملا تھا۔ وہ ایک صاف ستھرا، جدید، چھوٹا سا، چار منزلہ اسپتال تھا جس کا بیشتر اسٹاف آئرش، پارسی اور کرسچین تھا۔ مہنگا ہونے کے باوجود وہاں داخلہ مشکل سے ملتا تھا۔ کاغذی کارروائی کے بعد مینا کماری کو داخل کیا گیا اور سب سے پہلے ان کے پیٹ سے پانی نکالا گیا جس کے بعد ان کی طبیعت میں بہتری آئی۔ کمال امروہی کو بھی اس دوران مینا کماری کے اسپتال میں داخل ہونے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ شام کو پانچ بجے کے قریب اپنے بیٹے کے ساتھ اسپتال پہنچے اور بیٹے کو ویٹنگ روم میں بٹھا کو خود مینا کماری کے بیڈ پر آن بیٹھے۔

ان کے چہرے پر افسردگی تھی۔ ان کی اور مینا کماری کی محبت برسوں پہلے اسی طرح ایک اسپتال کے بیڈ سے شروع ہوئی تھی جہاں وہ مینا کا ہاتھ تھام کر گھنٹوں بیٹھا کرتے تھے۔ وہ محبت اب خواب و خیال ہو چکی تھی۔ پُلوں کے نیچے سے نہ جانے کتنا پانی بہہ چکا تھا۔ وہ فلمی گانا اس صورتحال پر کتنا فٹ بیٹھتا تھا:

وقت نے کیا، کیا حسیں ستم

تم رہے نہ تم، ہم رہے نہ ہم

مینا کماری تکیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ چند لمحوں بعد انہوں نے اپنا سر کمال امروہی کے کندھے پر ٹکا دیا اور بہت دھیمی آواز میں بولیں ''میں نے دنیا کو بہت اچھی طرح دیکھ لیا۔ اب مجھے اس دنیا سے اور کچھ نہیں چاہیے۔ اب میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں آپ کی بانہوں میں جان دے دوں۔''

کمال امروہی کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ انہوں نے اپنا چشمہ اُتار کر صاف کیا اور رُندھی ہوئی آواز میں کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ نرس نے کمرے میں آ کر سب لوگوں کو گھر جانے کا حکم سنا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ رات کو مریض کے پاس کوئی نہیں رہے گا۔

دوسرے روز مینا کماری کی طبیعت کافی بہتر دکھائی دی۔ شاید یہ کہاوت درست ہے کہ شمع بجھنے سے پہلے ایک بار بھڑکتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مہلک بیماریوں میں مبتلا افراد کی حالت، ان کے انتقال سے ایک آدھ دن پہلے کچھ بہتر نظر آنے لگتی ہے۔ مینا کماری کی حالت بھی 29 مارچ کی صبح بہتر دکھائی دے رہی تھی لیکن رات کو ان کی تکلیف بہت بڑھ گئی۔ وہ درد سے تڑپ رہی تھیں۔ کوئی دوا ان پر اثر نہیں کر رہی تھی۔ 30 مارچ کو آٹھ ڈاکٹروں نے ان کی حالت کے بارے میں صلاح مشورے کے لیے میٹنگ کی۔

آخرکار ایک ٹرنک کال کے ذریعے بڑی مشکلوں سے لندن کی اس ڈاکٹر سے رابطہ کیا گیا جس نے 1968ء میں مینا کماری کا علاج کیا تھا۔ وہ اپنی مریضہ کو بھولی نہیں تھی لیکن مینا کماری کا ذکر سن کر وہ حیرت سے بولی ''کیا وہ ابھی تک زندہ ہے؟'' مینا کماری کی کیفیت اور طبّی اصطلاحوں میں ان کا احوال سن کر اس نے بھی کہہ دیا کہ صحت یابی کا امکان نہیں ہے لیکن آخری امید کے طور پر ایک انجکشن آزمایا جا سکتا ہے۔ وہ انجکشن صرف یورپ میں دستیاب تھا۔

پروڈیوسر، ڈائریکٹر او۔ پی رالن جو مینا کماری کی عیادت کے لیے آئے ہوئے تھے، انہوں نے فوری طور پر لندن میں ایک دوست کو فون کیا کہ وہ انجکشن خرید کر پہلی فلائٹ سے ممبئی پہنچے۔ گویا اس وقت المیہ اداکاری کی ملکہ کی جان بچانے کے لیے دو براعظموں میں کوششیں جاری تھیں۔ اس وقت مینا کماری کی حالت یہ تھی کہ وہ جوس کے دو گھونٹ بھی پیتی تھیں تو الٹی کر دیتی تھیں لیکن وہ کمزور آواز میں اپنی سوتیلی بہن خورشید سے پوچھ رہی تھیں ''آپا! آپ نے کھانا کھا لیا؟''

مینا کماری کے جسم میں کئی جگہ سوئیاں پیوست تھیں اور ان سے نالیاں جڑی ہوئی تھیں۔ آدھی رات کے قریب ان کی ذرا آنکھ لگ گئی۔ اُدھر باہر راہداری میں رکھا ہوا فون مسلسل بج رہا تھا۔ مینا کماری کی حالت جاننے کے لیے نہ جانے کس کس کے فون آ رہے تھے۔ بیگم پارہ جو بیمار پرسی کے لیے آئی ہوئی تھیں، انہیں ذمے داری سونپی گئی کہ وہ فون کالز کا جواب دیتی رہیں۔ سائرہ بانو بھی آئی ہوئی تھیں۔ کمال امروہی اپنی پہلی بیوی اور بچوں سمیت موجود تھے۔ وہ مینا کماری کے سرہانے بیٹھے دھیرے دھیرے ان کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے تھے۔ مینا کماری کی سانس بہت مدھم چل رہی تھی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ سو رہی تھیں یا بے ہوش تھیں۔ اس رات کوئی اپنے گھر تو کیا جاتا، اُلٹا ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ، آنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

خورشید کسی کام کے لیے کمرے سے نکلیں تو چند لمحے بعد انہیں مینا کماری کی چیخ سنائی دی۔ وہ گھبرا کر الٹے قدموں بھاگی بھاگی کمرے میں آئیں تو دیکھا، مینا کماری اپنی نالیوں اور نلکیوں سمیت بیڈ پر اٹھ بیٹھی تھیں۔ خورشید کو دیکھ کر انہوں نے دونوں بازو پھیلائے، گویا ان سے لپٹ جانا چاہتی ہوں۔ اسی حالت میں وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولیں ''آپا! میں مرنا نہیں چاہتی...!''

خورشید نے انہیں بانہوں میں بھر لیا اور چپکے چپکے رونے لگیں۔ دوسرے ہی لمحے مینا کماری کی گردن ڈھلک گئی۔ وہ کوما میں چلی گئی تھیں۔ دوسرے روز وہ دوپہر تک کوما میں رہیں۔ بیگم پارہ بولیں ''خدا کے لیے، کوئی کہیں سے آبِ زم زم لے آئے۔ ان کے منہ پر آبِ زم زم کے چھینٹے دو۔ ہوش میں آ جائیں گی۔''

مینا کماری کے گھر پر آبِ زم زم موجود تھا۔ خورشید کے شوہر الطاف آبِ زم زم لانے کے لیے جانے لگے لیکن کسی نے یاد دلایا کہ مینا کماری کا گھر وہاں سے سولہ میل دور ہے۔ کمو نامی ایک اداکارہ نے کہا کہ اس کا گھر قریب ہے اور اس کے گھر میں آبِ زم زم موجود ہے۔ وہ واقعی تھوڑی دیر میں لے آئی۔ مقدس پانی کے چند چھینٹے چہرے پر دیئے گئے اور ایک چمچے کے ذریعے چند قطرے مینا کماری کے حلق میں ڈالنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ کمرا لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا مگر کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ساڑھے تین بجے مینا کماری نے آہستگی سے دو تین سیکنڈ کے لیے آنکھیں کھول کر اپنے ارد گرد کھڑے لوگوں کو دیکھا اور پھر، اَن گنت دلوں پر راج کرنے والی وہ آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

کمرے میں ایک کہرام برپا ہو گیا۔ ہر کوئی اس طرح دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا جیسے مینا سے اس کا سب سے قریبی رشتہ تھا۔ مینا نے ایک بار اپنی ڈائری میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اس کی قبر کے کتبے پر یہ سطریں کندہ کرائی جائیں:

'اس کی زندگی کچھ اس طرح ختم ہوئی جیسے بربط کا کوئی تار ٹوٹ جاتا ہے، جیسے کوئی نغمہ ادھورا رہ جاتا ہے، جیسے خاموشی سے دل ٹوٹ جاتا ہے... لیکن وہ اپنے دل میں کوئی پچھتاوا لے کر اس دنیا سے رخصت نہیں ہوئی۔ وہ جو بھی تھی، جیسی بھی تھی، اس نے کسی سے کوئی شکوہ نہیں کیا، کسی کو کوئی الزام نہیں دیا۔'

مقبول اداکاروں کی موت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ اس وقت ذرائع ابلاغ اتنے نہیں تھے، جتنے آج ہیں، اس کے باوجود جب سات بجے کے قریب ایمبولینس مینا کماری کی میت لے کر ''لینڈ مارک'' نامی بلڈنگ کے سامنے پہنچی تو وہاں ہزار ڈیڑھ ہزار افراد کا مجمع موجود تھا۔ ہجوم کو قابو میں رکھنے کے لیے پولیس بھی آن پہنچی۔ کمال امروہی اور دیگر افراد، اسٹریچر پر مینا کماری کے مردہ جسم کو اٹھائے، ایک ایک سیڑھی نہایت احتیاط اور آہستگی سے چڑھ کر گیارہویں منزل پر پہنچے۔ حیرت کی بات تھی کہ لوگ سیڑھیوں میں بھی دونوں طرف گیارہویں منزل تک کھڑے تھے۔ راہداریوں میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ وہ سب مینا کماری اور ان کے اہل خانہ کے لیے اجنبی تھے لیکن مینا کماری ان سب کے لیے اجنبی نہیں تھیں۔ شاید وہ ان کے دلوں میں بستی تھیں۔

مینا کماری کو ان کے اس بیڈ پر لٹا دیا گیا جس پر شاید انہوں نے بہت سی بے خواب راتیں گزاری تھیں۔ وہ ہمیشہ کی نیند سوتے ہوئے اس سے زیادہ خوبصورت اور پُرسکون لگ رہی تھیں، جتنی زندگی میں لگتی تھیں۔ فلم انڈسٹری کی ہر قابل ذکر شخصیت اس وقت اس فلیٹ میں یا اس عمارت میں موجود تھی۔ جے راج، بھارت بھوشن، کرن دیوان، راجکمار، ششی کپور، راجندر کمار، سنجیو کمار، امیتابھ بچن، انیل دھون، نوین نشچل، رندھیر کپور، سمیر، ونود کھنہ، شترو گھن سہنا، ناصر خان، نروپا رائے، کامنی کوشل، نمی، وحیدہ رحمن، سادھنا، نندا، راکھی، لینا چندرورکر، جیا بھادری، فریدہ جلال، ہیلن، نسیم بانو، ستارہ دیوی اور نہ جانے کون کون تھا۔ سب کے نام گنوانے کے لیے بہت جگہ چاہیے۔ اپنے وقت کے تمام بڑے پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور میوزک ڈائریکٹر بھی تھے۔ لندن میں جس شخص کو انجکشن خرید کر، پہلی فلائٹ سے آنے کی ہدایت کی گئی تھی، وہ بھی انجکشن لے کر آن پہنچا لیکن اس وقت مینا کماری کے انتقال کو آٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔

صبح آٹھ بجے فلیٹ سے ایک ایک سیڑھی احتیاط سے اتر کر مینا کماری کا جنازہ نیچے لایا گیا۔ کمال امروہی اور ان کا بیٹا جنازہ اٹھانے والوں میں شامل تھے۔ مینا کماری کے بے جان وجود کو اسی کفن میں لپیٹا گیا تھا جو انہوں نے عرصہ پہلے مکہ سے منگوا کر بڑی عقیدت و احترام سے رکھا ہوا تھا۔ جنازہ جب آہ و بکا کے شور میں سڑک پر پہنچا تو سامنے سے تیز رفتاری سے ایک سیاہ مرسیڈیز آ کر رکی۔ اس میں سے دلیپ کمار اترے۔ ان کا چہرہ دکھ سے ستا ہوا تھا اور آنکھیں نم تھیں... اور اس وقت وہ کسی فلم کا شاٹ نہیں دے رہے تھے۔ وہ ممبئی سے باہر کہیں گئے ہوئے تھے، اسی وقت واپس پہنچے تھے۔ انہیں مینا کماری کے انتقال کی اطلاع ملی تھی اور وہ سیدھے، جنازے پر آ گئے تھے۔ وہ مینا کے سفر آخرت میں ان کے ساتھ میت گاڑی میں بیٹھے۔ ہجوم پولیس کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ ہر کوئی مینا کماری کا آخری دیدار کرنا چاہتا تھا۔

ایک میت گاڑی، دس پندرہ کاروں اور ہزاروں پیدل افراد پر مشتمل جنازے کا قافلہ ''رحمت باغ'' قبرستان پہنچا جہاں مینا کماری کے لیے قبر تیار تھی۔ وہاں بھی جنازے کی آمد کی خبر پہلے ہی سے پہنچ چکی تھی۔ ہزاروں افراد وہاں بھی موجود تھے۔ آخری رسوم کے بعد کمال امروہی کے دو بیٹوں کی مدد سے مینا کماری کو قبر میں اُتار دیا گیا اور وہ بھی دوسرے اَن گنت مشہور اور گمنام لوگوں کی طرح پیوند خاک ہو گئیں۔ دلیپ کمار اور کمال امروہی سمیت بہت سے مشاہیر نے مٹی کی مٹھیاں بھر کر قبر میں ڈالیں اور بادیدۂ نم فاتحہ پڑھی۔ بس، یہی مینا کماری کی داستانِ حیات... یا پھر داستانِ حسرت کا اختتام تھا!

تدفین کے صرف دو برس بعد ایک صاحب کو مینا کماری کی قبر پر جانے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے بتایا ''قبر بڑی مشکل سے ملی۔ قبر اور قبرستان دونوں ہی اس وقت بری حالت میں تھے۔ ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ تھے۔ قبریں شکستہ تھیں۔ گورکن نے مجھے بتایا کہ مینا کماری کے انتقال کے بعد کچھ عرصے کے دوران ایک مرتبہ کمال امروہی اور چند بار خورشید فاتحہ خوانی کے لیے آئیں۔ اس کے بعد سے آج تک کوئی نہیں آیا۔ تاہم میری وہاں موجودگی کے دوران ایک صاحب آئے اور انہوں نے فاتحہ پڑھی۔ وہ دبئی سے آئے تھے اور مینا کماری کے کوئی پرانے پرستار تھے۔ پھر ایک بچی آئی اور فاتحہ پڑھ کر خاموشی سے چلی گئی۔ نہ جانے وہ کون تھی۔ میرے پوچھنے پر بھی اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔''

اس آخری اطلاع کو بھی آج 43 سال گزر چکے ہیں۔ نہ جانے آج مینا کماری کی آخری آرام گاہ کس حال میں ہو۔ معلوم نہیں اب اس کا کوئی نام و نشاں بھی باقی ہو یا نہیں۔

(ختم شد)